جلد (۲) عدد (۶)۔
۷۸۶
جمادی الاخریٰ ۱۳۵۲ھ

# ترجمان القرآن

## مجلس تحریک قرآن کا ماہوار رسالہ

مرتبۂ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت سالانہ صمہ
بیرون ہند کے لئے (ے)
قیمت فی پرچہ ر

خالی صفحه

# فہرست مضامین

# اطلاع

آپ کی مدت خریداری اس مہینے (جمادی الثانی) میں ختم ہو رہی ہے۔ اگر آپ کسی وجہہ سے آئندہ سال کے لئے خریداری کا سلسلہ جاری نہہ رکھنا چاہتے ہوں تو آئندہ مہینے کی دسوین تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیسکتے ہیں۔ آپ کی جانب سے اس قسم کی کوئی اطلاع موصول نہہ ہونے سے یہہ سمجھا جائیگا کہہ آپ خریداری کا سلسلہ جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ اور آئندہ مہینے (رجب) کا پرچہ بذریعہ وی پی ارسال ہو گا۔

میذیجر

# اشارات

سیاست، تجارت، صنعت و حرفت، اور علوم و فنون کے میدانوں میں مغربی قوموں کے حیرت انگیز اقدامات کو دیکھ کر بہت سے دل اور دماغ سخت دہشت زدہ ہو جاتے ہیں۔ انہیں یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ شاید ان قوموں کی ترقی لازوال ہے۔ دنیا پر ان کے غلبہ و تسلط کا دائمی فیصلہ ہو چکا ہے۔ ربع مسکون کی حکومت، اور عناصر کی فرمانروائی کا انھیں ٹھیکہ دیدیا گیا ہے۔ اور ان کی طاقت ایسی مضبوط بنیادوں پر قائم ہوگئی ہے کہ کسی کے اکھاڑے نہیں اکھڑ سکتی۔

ایسا ہی گمان ہر زمانے میں ان سب قوموں کے متعلق کیا جا چکا ہے۔ جو اپنے اپنے وقت کی غالب قومیں تھیں۔ مصر کے فراعنہ، عرب کے عاد و ثمود، عراق کے کلدانی، ایران کے اکاسرہ، یونان کے جہانگیر فاتح، روم کے عالمگیر فرمانروا، اسلام کے جہاں کشا مجاہد، تاتار کے عالم سوز سپاہی، سب اس کرۂ خاکی کے اسٹیج پر اسی طرح غلبہ و قوت کے تماشے دکھا چکے ہیں۔ ان میں سے جس جس کے کھیل کی باری آئی، اس نے اپنی چلت پھرت کے کرتب دکھا کر اسی طرح دنیا کو حیرت میں ڈال ڈال دیا ہے۔ ہر قوم جب اٹھی ہے تو وہ اسی طرح دنیا پر چھا گئی ہے، اسی طرح اس نے چار دانگ عالم میں اپنی شوکت و جبروت کے ڈنکے بجائے ہیں اسی طرح دنیا نے مبہوت ہو کر گمان کیا ہے کہ ان کی طاقت لازوال ہے۔ ——— مگر جب انکی اجل پوری ہو گئی اور حقیقت میں لازوال طاقت رکھنے والے فرمانروا نے ان کے زوال کا اٹل فیصلہ صادر کر دیا، تو وہ ایسے گرے کہ اکثر تو صفحۂ ہستی سے ناپید ہی ہو گئے، اور بعض کا نام و نشان اگر دنیا میں باقی رہا بھی، تو وہ اسطرح کہ وہ اپنے محکوموں کے محکوم ہوئے اپنے غلاموں کے غلام بنے، اپنے مغلوبوں سے مغلوب ہو کر رہے۔ قَدْ خَلَتْ مِنْ

قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ (۳: ۱۴)

---

کائنات کا نظام کچھ اس طور پر واقع ہوا ہے کہ اس میں کہیں سکون اور ٹھیراؤ نہیں ہے۔ ایک پیہم حرکت، تغیر اور گردش ہے جو کسی چیز کو ایک حالت پر قرار نہیں لینے دیتی۔ ہر کون کے ساتھ ایک فساد ہے، ہر بناؤ کے ساتھ ایک بگاڑ ہے، ہر بہار کے ساتھ ایک خزاں ہے، ہر چڑھاؤ کے ساتھ ایک اتار ہے، اور اسی طرح اس کا عکس بھی ہے۔ ایک ماشہ بھر کا دانہ آج ہوا میں اڑا اڑا پھرتا ہے، کل وہی زمین میں استحکام حاصل کر کے ایک تناور درخت بن جاتا ہے، پرسوں وہی سوکھ کر پیوند خاک ہو جاتا ہے، اور پھر فطرت کی نو بخشنے والی قوتیں اسے چھوڑ کر کسی دوسرے بیج کی پرورش میں لگ جاتی ہیں۔ یہ زندگی کے اتار چڑھاؤ ہیں۔ انسان جب ان میں سے کسی ایک حالت کو زیادہ طویل مدت تک جاری رہتے ہوئے دیکھتا ہے، تو سمجھتا ہے کہ یہ حالت دائمی ہے۔ اگر اتار ہے تو سمجھتا ہے کہ اتار ہی رہے گا۔ اگر چڑھاؤ ہے تو خیال کرتا ہے کہ چڑھاؤ ہی رہے گا۔ لیکن یہاں فرق جو کچھ بھی ہے دیر اور سویر کا ہے۔ دوام کسی حالت میں بھی نہیں ہے۔ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (۳: ۱۴)

---

دنیا کے حالات ایک طرح کی دوری حرکت میں گردش کر رہے ہیں۔ پیدائش اور موت، جوانی اور بڑھاپا، قوت اور ضعف، بہار اور خزاں، شگفتگی اور پژمردگی سب اسی گردش کے مختلف شئون ہیں۔ اس گردش میں باری باری سے ہر چیز پر ایک دور اقبال کا آتا ہے جس میں وہ بڑھتی ہے، پھلتی ہے، قوت اور زور دکھاتی ہے، حسن اور بہار کی نمائش کرتی ہے حتیٰ کہ اپنی ترقی کی انتہائی حد کو پہنچ جاتی ہے، پھر ایک دوسرا دور ادبار کا آتا ہے جس میں وہ گھٹتی ہے، مرجھاتی ہے، ضعف اور ناتوانی میں مبتلا ہوتی ہے، اور آخر کار وہی قوتیں اس کا خاتمہ کر دیتی ہیں جنھوں نے اس کی ابتدا کی تھی۔

یہ اپنی مخلوقات میں اللہ تعالیٰ کی سنت ہے، اور دنیا کی سب چیزوں کے مانند یہی سنت انسانی

بھی جاری ہے، خواہ اس کو فرد کی حیثیت سے لیا جائے، یا قوم کی حیثیت سے۔ ذلت اور عزت، عسر اور یسر، تنزل اور ترقی۔ اور ایسی ہی دوسری تمام کیفیات اسی دوری حرکت کے ساتھ مختلف افراد اور مختلف قوموں میں تقسیم ہوتی رہتی ہیں۔ باری باری سے سب پر یہ دور گذرتے ہیں۔ ان میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو اس تقسیم میں کلیۃً محروم رکھا گیا ہو یا جس پر کسی ایک کیفیت کو دوام بخشا گیا ہو، عام اس سے کہ وہ اقبال کی کیفیت ہو یا ادبار کی۔

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (۳۳ : ۸)

---

روئے زمین کے چپہ چپہ پر ہم کو ان قوموں کے آثار ملتے ہیں جو ہم سے پہلے ہو گذری ہیں۔ وہ اپنے تمدن، تہذیب، اپنی صنعت و کاریگری، اپنی ہنرمندی و چابک دستی کے ایسے نشانات دنیا میں چھوڑ گئی ہیں جن کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آجکل کی ترقی یافتہ اور غالب قوموں سے کچھ کم نہ تھیں بلکہ اپنے ہم عصروں پر ان کا غلبہ کچھ ان سے زیادہ ہی تھا۔ كَانُوْا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّ اَثَارُوا الْاَرْضَ وَ عَمَرُوْهَا اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا (۳۰: ۹) مگر پھر ان کا حشر کیا ہوا؟ اقبال سامنے دیکھ کر وہ دھوکہ کھا گئے۔ نعمتوں کی بارش نے ان کو غرہ میں ڈال دیا۔ خوشحالی ان کے لئے فتنہ بن گئی۔ غلبہ اور حکومت سے مغرور ہو کر وہ جبار و قہار بن بیٹھے۔ انہوں نے اپنے کرتوتوں سے اپنے نفس پر آپ ظلم کرنا شروع کر دیا۔ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ (۱۱: ۱۰) خدا نے ان کی سرکشی کے باوجود ان کو ڈھیل دی وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ (۲۲: ۶) اور یہ ڈھیل بھی کچھ معمولی ڈھیل نہ تھی بعض قوموں کو صدیوں تک یونہی ڈھیل دی جاتی رہی۔ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (۲۲: ۶) مگر یہ مہلت ان کے لئے ایک نیا فتنہ بن گئی۔ وہ سمجھے کہ خدا ان کی تدبیروں کے مقابلہ میں عاجز آگیا ہے۔ اور اب دنیا پر خدا کی نہیں ان کی حکومت ہے۔ آخر کار قہر الٰہی بھڑک اٹھا۔ ان کی طرف سے نظر عنایت پھر گئی۔ اقبال کے بجائے ادبار کا دور آگیا۔ ان کی چالوں کے مقابلہ میں خدا بھی ایک چال چلا۔ مگر خدا کی چال ایسی تھی کہ وہ اس کو سمجھ ہی نہ سکتے تھے پھر اس کا

توڑ کہاں سے کرتے وَمَکَرُوْا مَکْرًا وَّمَکَرْنَا مَکْرًا وَّهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ (۲۷: ۵۰)، خدا کی چال سامنے سے نہیں آتی خود انسان کے اندر سے اس کے دماغ اور دل میں سرایت کرکے اپنا کام کرتی ہے۔ وہ انسان کی عقل، اس کے شعور، اس کی تمیز، اس کی فکر، اس کے حواس پر حملہ کرتی ہے۔ وہ اس کے بیتے کی آنکھیں پھوڑ دیتی ہے، وہ اس کو آنکھوں کا اندھا نہیں بلکہ عقل کا اندھا بنا دیتی ہے۔ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَی الْاَبْصَارُ وَلٰکِنْ تَعْمَی الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ (۲۲: ۴۶)۔ اور جب اس کے دل کی آنکھیں پھوٹ جاتی ہیں تو ہر تدبیر جو وہ اپنی بہتری کے لیے سوچتا ہے، وہ الٹی اس کے خلاف پڑتی ہے۔ ہر قدم جو وہ کامیابی کے مقصود کی طرف بڑھاتا ہے، وہ اس کو ہلاکت ہی کی طرف لے جاتا ہے اس کی ساری قوتیں خود اس کے خلاف بغاوت کر دیتی ہیں۔ اور اس کے اپنے ہاتھ اس کا گلا گھونٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ فَانْظُرْ کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ مَکْرِهِمْ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِیْنَ (۲۷: ۵۱)

---

اس اقبال و ادبار کا ایک مکمل نقشہ ہم کو آل فرعون اور بنی اسرائیل کے قصے میں ملتا ہے۔ اہل مصر جب ترقی کے انتہائی مدارج کو پہنچ گئے تو انہوں نے ظلم و سرکشی پر کمر باندھی ان کے بادشاہ فرعون نے خدائی کا دعویٰ کیا، اور ایک کمزور قوم بنی اسرائیل کو جو حضرت یوسف کے زمانے میں وہاں جا کر آباد ہو گئی تھی۔ حد سے زیادہ جور و ستم کا تختۂ مشق بنایا آخر جب اس کی اور اہل مصر کی سرکشی حد سے بڑھ گئی تو خدا نے ارادہ کیا کہ ان کو نیچا دکھائے اور اسی ضعیف قوم کو سربلند کرے جس کو وہ ہیچ سمجھتے تھے، چنانچہ اللہ کا ارادہ پورا ہوا اس ضعیف قوم میں حضرت موسیٰ پیدا کئے گئے، ان کو خود فرعون کے گھر میں خود اس کے ہاتھوں سے پرورش کرایا گیا اور انھیں اس خدمت پر مامور کیا گیا کہ اپنی قوم کو مصریوں کی غلامی سے نجات دلائیں۔ انھوں نے فرعون کو نرمی کی راہ سے سمجھایا مگر وہ باز نہ آیا خدا کی طرف سے فرعون اور اس کی قوم کو مسلسل تنبیہیں کی گئیں۔ قحط پر قحط پڑے طوفان پر طوفان آئے۔ خون برسا، ٹڈی دل، ان کی کھیتیوں کو چاٹ گئے۔ جوؤں اور مینڈکوں نے ان کو خوب ستایا، مگر ان کے

تکبر میں فرق نہ آیا۔ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ (۷: ۱۶) جب تمام حجتیں ایک ایک کرکے ختم ہو چکیں تو عذاب الٰہی کا فیصلہ نافذ ہو گیا۔ خدا کے حکم سے حضرت موسیٰ اپنی قوم کو لیکر مصر سے نکل گئے فرعون اپنے لشکروں سمیت سمندر میں غرق کر دیا گیا اور مصر کی طاقت ایسی تباہ ہوئی کہ صدیوں تک نہ ابھر سکی۔ فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ۔ (۲۸: ۴) —

---

پھر بنی اسرائیل کی باری آئی مصری قوم کو گرانے کے بعد کائنات کے حقیقی فرمانروا نے اس قوم کو زمین کی حکومت بخشی جو دنیا میں ذلیل و خوار تھی وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْ اِسْرَآءِيْلَ بِمَا صَبَرُوْا (۷: ۱۶) اور اس کو دنیا کی تمام قوموں پر فضیلت عطا فرمائی وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (۲: ۶)

مگر یہ فضیلت اور وراثت ارضی حسن عمل کی شرط کیساتھ مشروط تھی۔ حضرت موسیٰ کی زبان سے پہلے ہی کہوا دیا گیا تھا کہ تم کو زمین کی خلافت دی تو ضرور جائیگی۔ مگر اس بات پر بھی نظر رکھی جائے گی کہ تم کیسے عمل کرتے ہو؟ (كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ) اور یہ وہ شرط ہے جو بنی اسرائیل کے ساتھ ہی مخصوص نہیں بلکہ جس قوم کو بھی زمین کی حکومت دی جاتی ہے اس پر یہی شرط لگا دی جاتی ہے۔ ثم جعلنکم خلٰئف فی الارض من بعدھم لننظر کیف تعملون (۱۰: ۲)

پس جب بنی اسرائیل نے اپنے رب سے سرکشی کی، اس کے کلام میں تحریف کی، حق کو باطل سے بدل ڈالا حرام خواری، جھوٹ، بے ایمانی اور عہد شکنی کا شیوہ اختیار کیا، زر پرست، حریص، بزدل اور آرام طلب بن گئے، اپنے انبیاء کو قتل کیا، حق کی طرف بلانے والوں سے دشمنی کی، ائمہ خیر سے منہ موڑا، آئمہ شر کی اطاعت اختیار کی تو رب العالمین کی نظر ان کی طرف سے بھی پھر گئی۔ ان سے زمین کی وراثت چھین لی گئی۔ ان کو عراق، یونان،

اور روم کے جابر سلاطین سے پامال کرایا گیا، ان کو گھر سے بے گھر کر دیا گیا۔ ان کو ذلت و خواری کے ساتھ ملک ملک کی خاک چھنوائی گئی، اور حکومت کا استحقاق ہمیشہ کے لئے ان سے چھین لیا گیا۔ تین ہزار برس سے وہ خدا کی لعنت میں ایسے گرفتار رہوئے ہیں۔ کہ دنیا میں ان کو کہیں عزت کا ٹھکانا نہیں ملتا۔ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ (۲ : ۷)

---

آج اسی سنت الٰہی کا اعادہ پھر ہماری نگاہوں کے سامنے ہو رہا ہے جس شامت اعمال میں پچھلی قومیں گرفتار ہوئی تھیں اسی شامت نے آج مغربی قوموں کو آن پکڑا ہے جتنی تنبیہیں ممکن تھیں وہ سب ان کو دی جا چکی ہیں۔ جنگ عظیم کے مصائب، معاشی مشکلات، بے کاری کی کثرت، امراض خبیثہ کی شدت، نظام عائلی کی برہمی۔ یہ سب کھلی ہوئی روشن آیات ہیں، جن سے وہ اگر آنکھیں رکھتے تو معلوم کر سکتے تھے کہ ظلم، سرکشی، نفس پرستی، اور حق فراموشی کے کیا نتائج ہوتے ہیں۔ مگر وہ ان آیات سے سبق نہیں لیتے حق سے منہ موڑنے پر برابر اصرار کئے جا رہے ہیں۔ ان کی نظر علتِ مرض تک نہیں پہونچتی۔ وہ صرف آثار مرض کو دیکھتے ہیں۔ اور انہی کا علاج کرنے میں اپنی ساری تدبیریں صرف کر ڈالتے ہیں۔ اس لئے جوں جوں دوا کی جاتی ہے مرض بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اب حالات کہہ رہے ہیں کہ تنبیہوں اور حجتوں کا دور ختم ہونے والا ہے۔ اور آخری فیصلے کا وقت قریب ہے۔

---

قدرت الٰہی نے دو زبردست شیطان مغربی قوموں پر مسلط کر دیے ہیں۔ جو ان کو ہلاکت اور تباہی کی طرف کھینچے لئے جا رہے ہیں۔ ایک قطع نسل کا شیطان ہے اور دوسرا جنگ کا شیطان۔ پہلا شیطان ان کے افراد پر مسلط ہے اور دوسرا ان کی قوموں اور سلطنتوں پر۔ پہلے نے ان کے مردوں اور ان کی عورتوں کی عقلیں خراب کر دی ہیں وہ خود ان کے اپنے ہاتھوں سے ان کی نسلوں کا استیصال کرا رہا ہے۔ وہ انھیں منع حمل کی تدبیریں سجھاتا ہے اسقاط حمل پر آمادہ کرتا ہے، عمل تعقیم (Sterilisation) کے فوائد بتاتا ہے جس سے وہ اپنی

قوت تولید کا بیج ہی مار دیتے ہیں۔ انھیں اتنا شقی القلب بنا دیتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو آپ ہلاک کرتے ہیں۔ غرض یہ شیطان وہ ہے جو تدریج ان سے خودکشی کرا رہا ہے۔

دوسرے شیطان نے ان کے بڑے بڑے سیاسی مدبروں اور جنگی سپہ سالاروں سے صحیح فکر اور صحیح تدبیر کی قوت سلب کر لی ہے۔ وہ ان میں خودغرضی، مسابقت، منافرت، عصبیت، اور حرص و طمع کے جذبات پیدا کر رہا ہے۔ وہ ان کو مخاصم اور معاند گروہوں میں تقسیم کر رہا ہے۔ انھیں ایک دوسرے کی طاقت کا مزا چکھایا جا رہا ہے کہ یہی عذاب الٰہی کی ایک صورت ہے اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَيُذِيقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ (۶: ۶۵) وہ ان کو ایک بڑی زبردست خودکشی کے لئے تیار کر رہا ہے، جو دیر ہی نہیں بلکہ آنی ہوگی۔ اس نے تمام دنیا میں بارود کے خزانے جمع کر دیے ہیں۔ اور جگہ جگہ خطرے کے مرکز بنا رکھے ہیں۔ اب وہ صرف ایک وقت کا منتظر ہے جونہی کہ اس کا وقت آیا وہ کسی ایک خزانۂ بارود کو شتابہ دکھا دے گا۔ اور پھر آن کی آن میں وہ تباہی نازل ہوگی جس کے آگے تمام پچھلی قوموں کی تباہیاں ہیچ ہو جائیں گی۔

---

یہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس میں کسی قسم کا مبالغہ نہیں ہے بلکہ یورپ امریکہ اور جاپان میں آئندہ جنگ کے لئے جس قسم کی تیاریاں کی جا رہی ہیں، ان کو دیکھ دیکھ کر خود ان قوموں کے اہل بصیرت لرز رہے ہیں اور اس جنگ کے نتائج کا تصور کر کے ان کے حواس باختہ ہوئے جاتے ہیں۔ حال ہی میں سرجل نیومان (Sergel Neumann) نے جو پہلے امریکہ کے طبری شاف کا ایک رکن تھا، آئندہ جنگ پر ایک مضمون لکھا ہے۔ اس میں وہ کہتا ہے کہ آئندہ جنگ محض فوجوں کی لڑائی نہیں ہوگی بلکہ ایک قتل عام کہنا چاہئے جس میں عورتوں اور بچوں تک کو نہ چھوڑا جائیگا۔ سائنس دانوں کی عقل نے جنگ کا کام سپاہیوں سے چھین کر کیمیاوی مرکبات اور بے روح آلات کے سپرد کر دیا ہے۔ جو مقاتل (Combatant) اور غیر مقاتل (Non Combatant) میں تمیز کرنے سے قاصر ہیں اب محاربہ طلق آتشیں

کی لڑائی، میدانوں اور قلعوں میں نہیں بلکہ شہروں اور بستیوں میں ہوگی کیونکہ جدید نظریہ کے مطابق غنیم کی اصلی قوت فوجوں میں نہیں بلکہ اس کی آبادیوں، اس کی تجارتی منڈیوں اور صنعتی کارگاہوں میں ہے۔

---

اب ہوائی جہازوں سے طرح طرح کے بم برسائے جائیں گے جن سے آتش فشاں مادے زہریلی ہوائیں اور امراض کے جراثیم نکل کر وقت واحد میں ہزاروں لاکھوں کی آبادی کو نیست و نابود کر دیں گے ان میں سے ایک قسم کے بم (Lewisite Bombs) ایسے ہیں جن کا ایک گولہ لندن کی بڑی سے بڑی عمارت کو پارہ پارہ کر سکتا ہے۔ ایک زہریلی ہوا (Green Cross gass) کے نام سے موسوم ہے جس کی خاصیت یہ ہے کہ جو اس کو سونگھے گا وہ ایسا محسوس کریگا کہ گویا پانی میں ڈوب گیا ہے۔ ایک دوسری قسم کی زہریلی ہوا (Yellow Cross) میں سانپ کے زہر کی سی خاصیت ہے، اور اس کے سونگھنے سے بالکل وہی اثرات ہوتے ہیں۔ جو سانپ کے کاٹنے سے ہوتے ہیں۔ اسی قسم کی بارہ[12] زہریلی ہوائیں اور بھی ہیں جو تقریباً غیر مرئی ہیں۔ اُن کے اثرات ابتداءً بالکل محسوس نہیں ہوتے، اور جب محسوس ہوتے ہیں تو تدبیر علاج کے امکانات باقی نہیں رہتے۔ ان میں سے ایک خاص ہوا ایسی ہے جو بہت بلندی پر پہنچ کر پھیل جاتی ہے، اور جو ہوائی جہاز اس کے حلقہ سے گذرتا ہے اس کا چلانے والا یکایک اندھا ہو جاتا ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ اس قسم کی ہوائیں اگر ایک ٹن کی مقدار میں شہر پیرس پر چھوڑی جائیں تو ایک گھنٹہ کے اندر اس کو کلیۃً تباہ کیا جا سکتا ہے اور یہ ایسا کام ہے جس کو انجام دینے کے لئے صرف .. اہوائی جہاز کافی ہیں۔

---

حال میں ایک برقی آتش فشاں گولہ ایجاد کیا گیا ہے جس کا وزن صرف ایک کیلوگرام ہوتا ہے مگر اتنے سے گولہ میں یہ قوت ہے کہ جب کسی چیز سے اس کا تصادم ہوتا ہے تو دفعتہً تین ہزار درجہ فارن ہیٹ کی حرارت پیدا ہوتی ہے اور اس سے ایسی آگ بھڑک اٹھتی ہے جو کسی چیز سے بجھائی نہیں جا سکتی۔ پانی اس کے حق میں

پشرول ثابت ہوا ہے اور ابھی تک سائنس اس کے بجھانے کا کوئی طریقہ دریافت نہیں کر سکا ہے۔ خیال یہ ہے کہ ان گولوں کو شہروں کے بڑے بڑے بازاروں پر پھینکا جائے گا تاکہ اس سرے سے اس سرے تک آگ لگ جائے، پھر جب لوگ سراسیمہ ہو کر بھاگنے لگیں گے تو ہوائی جہازوں سے زہریلی ہواؤں کے بم برسائے جائیں گے، جن سے تباہی کی تکمیل ہو جائے گی۔

ان ایجادات کو دیکھ کر ماہرین فن نے اندازہ لگایا ہے کہ چند ہوائی جہازوں سے دنیا کے بڑے سے بڑے اور محفوظ دارالسلطنت کو دو گھنٹوں میں پیوند خاک کیا جا سکتا ہے۔ لاکھوں کی آبادی کو اس طرح مسموم کیا جا سکتا ہے کہ رات کو اچھے خاصے سوئیں اور صبح کو ایک بھی زندہ نہ اٹھے۔ زہریلے مادوں سے ایک پورے ملک میں پانی کے ذخائر کو مسموم، مواشی اور حیوانات کو ہلاک، کھیتوں اور باغوں کو غارت کیا جا سکتا ہے۔ ان تباہ کن حملوں کی مدافعت کا کوئی مؤثر ذریعہ ابھی تک ایجاد نہیں ہوا ہے۔ بجز اس کے کہ دونوں محارب فریق ایک دوسرے پر اسی طرح حملے کریں اور دونوں ہلاک ہو جائیں۔

---

یہ آئندہ جنگ کی طیاریوں کا ایک مختصر بیان ہے۔ اگر آپ تفصیلات معلوم کرنا چاہتے ہوں تو کتاب (**What would be the Character of a New war**) ملاحظہ کیجئے، جو جنیوا کی انٹر پارلیمنٹری یونین نے باقاعدہ تحقیقات کے بعد شائع کی ہے۔ اس کو پڑھ کر آپ اندازہ کر لیں گے کہ مغربی تہذیب نے کس طرح اپنی ہلاکت کا سامان اپنے ہاتھوں فراہم کیا ہے۔ اب اس کی عمر کا امتداد صرف اعلان جنگ کی تاریخ تک ہے، جس روز دنیا کی دو بڑی سلطنتوں کے درمیان جنگ چھڑی اسی روز سمجھ لیجئے کہ مغربی تہذیب کی تباہی کے لئے خدا کا فیصلہ صادر ہو چکا، کیونکہ دو بڑی سلطنتوں کے میدان میں اتر آنے کے بعد کوئی چیز جنگ کو عالمگیر ہونے سے نہیں بچا سکتی۔ اور جب جنگ عالمگیر ہوگی تو تباہی بھی عالمگیری ہی ہوگی

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (۳۰ : ۵) ۔ لوگوں کے اپنے ہاتھوں سے کئے ہوئے کرتوتوں نے خشکی اور تری میں فساد رونما ہوگیا ہے، تاکہ انہیں ان کے بعض اعمال کا مزہ چکھائے ۔ شاید وہ اب بھی رجوع کریں

بہرحال اب قریب ہے کہ وراثت ارضی کا نیا بندوبست ہو، اور ظالمین ومسرفین کو گرا کر کسی دوسری قوم کو جو غالباً مستضعفین ہی میں سے ہوگی، زمین کی خلافت پر سرفراز کیا جائے۔ دیکھنا ہے کہ اس مرتبہ حضرت حق کی نظر انتخاب کس پر پڑتی ہے۔

---

ہمارے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ آیندہ کونسی قوم اٹھائی جائے گی۔ یہ اللہ کی دین ہے جس سے چاہتا ہے چھینتا ہے۔ اور جس کو چاہتا عطا کرتا ہے۔ قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ (۳ : ۳) مگر اس معاملہ میں بھی اس کا ایک قانون ہے جسے اس نے اپنی کتاب عزیز میں بیان فرما دیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک قوم کو جب وہ اس کے برے اعمال کی وجہ سے گراتا ہے، تو اس کی جگہ کسی ایسی قوم کو اٹھاتا ہے جو اس مغضوب قوم کی طرح بدکار اور اس کے مانند سرکش نہ ہو۔

وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ (۴۷ : ۴) اگر تم نے روگردانی کی تو وہ تمہارے بجائے کسی اور قوم کو اٹھائے گا۔ پھر وہ لوگ تمہاری طرح نہ ہوں گے ۔

اس لئے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج کل جو کمزور اور مغلوب النفس قومیں مغربی تہذیب کی نقالی کررہی ہیں ۔ اور فرنگی اقوام کے محاسن کو (جو تھوڑے بہت ان میں باقی رہ گئے ہیں) اختیار کرنے کے بجائے ان معائب کو اختیار کررہی ہیں جو ان کے مغضوب ہونے کی علت ہیں ان کے لئے آیندہ انقلاب میں کامیابی وسرفرازی کا کوئی موقع نہیں ہے۔

# اسلامی تہذیب اور اسکے اصول و مبادی

(۶)

## زندگی کا نصب العین

یہاں تک دو امور کی تشریح کی جا چکی ہے۔ ایک یہ کہ اسلام نے کس چیز کو زندگی کا نصب العین قرار دیا ہے؟ دوسرے یہ کہ وہ کن وجوہ سے ایک بہترین نصب العین ہے؟ اب ہمیں اس مسئلہ کے تیسرے پہلو کی طرف نظر کرنی چاہئے اور وہ یہ ہے کہ اسلامی تہذیب کو ایک مخصوص تہذیب بنانے میں اس نصب العین کا کیا حصہ ہے اور اس نے اس تہذیب کو کونسی خصوصی شان بخشی ہے؟

**طریقوں کے امتیاز میں مقصد کی تعیین کا اثر**

پہلے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ زندگی کے تمام معاملات میں جس طرح مقصد کی تعیین ضروری ہے، اسی طرح طریق حصول مقصد کی تعیین بھی ضروری ہے۔ اور طریقہ کی تعیین، مقصد کی مناسبت کے سوا کسی اور بنیاد پر نہیں ہوسکتی۔ اگر کسی شخص کے پیش نظر نفس سلوک و سیر کے سوا کوئی متعین شے مقصود نہ ہو اور وہ محض راستوں اور گلیوں کی خاک چھانتا پھرے تو ہم اس کو مجنون یا آوارہ گرد کہتے ہیں۔ اور اگر وہ مقصد تو رکھتا ہو لیکن اس کی تحصیل کے مختلف طریقوں میں سے کسی خاص طریقہ کا پابند نہ ہو، بلکہ ہر اس طریقہ پر چلنے کے لئے طیار ہو جائے جس پر اسے موصل الی المقصود ہونے کا گمان ہو، تو اس کو بھی ہم احمق قرار دیتے ہیں کیونکہ از روئے عقل ایسا شخص کبھی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا جو ایک مقام کی طرف جانے کے لئے دس مختلف راستوں پر چلنے کی کوشش کرتا ہو۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اپنا مقصود تو کسی چیز کو قرار دے اور راستہ ایسا اختیار کرے جو اس کے مخالف سمت میں جانیوالا ہو، تو اس کو بھی ہم صاحب عقل نہیں سمجھتے کیونکہ وہ اس اعرابی کے مانند ہے جو کعبہ کی طرف جانے کے لئے ترکستان کی راہ پر چل رہا ہو۔ پس انسان کی عملی

کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ وہ سلوک کے لئے پہلے ایک مقصد متعین کرے، پھر اپنی نیتوں اور کوششوں کا رخ اسی مقصد کی طرف پھیر دے، اور اگر اس مقصد تک پہنچنے کے بہت سے رستے ہوں تو ان میں سے ایک رستے کو اختیار کرے جو اس کے نزدیک بہترین ہو، اور اس کے سوا دوسرے تمام راستوں کو چھوڑ دے۔

یہ ترک و اختیار عین مقتضائے عقل ہے اور مقصد کی تعیین کا عقلی نتیجہ یہی ہے کہ جو طریقہ اس مقصد سے خاص طور پر مناسبت رکھتا ہو اس کو اختیار کیا جائے۔ اور دوسرے تمام طریقوں کو ترک کر دیا جائے ایک صاحب عقل آدمی جب سفر کرتا ہے تو اسی ایک راستہ پر چلتا ہے جو ..... منزل مقصود تک پہنچانے والے راستوں میں سب سے بہتر ہو۔ اس کے سوا اور بیسیوں راستے جو اس کو دوران سفر میں ملتے ہیں۔ ان کی طرف وہ التفات بھی نہیں کرتا۔ ایک عقلمند طالب علم اپنے لئے علم کا وہی شعبہ اختیار کرتا ہے جو اس کے نصب العین کی تحصیل میں سب سے زیادہ مددگار ہوتا ہے۔ دوسرے جتنے شعبے اس سے غیر متعلق ہوتے ہیں ان میں اپنا وقت اور اپنا دماغ کھپانا وہ پسند نہیں کرتا ایک زیرک و دانا سوداگر اپنے لئے کاروبار کا وہی طریقہ اختیار کرتا ہے جو اس کے نزدیک حصول مراد کا بہترین وسیلہ ہو سکتا ہو۔ ہر کام میں اپنا سرمایہ لگانا اور ہر پیشہ میں اپنی محنت صرف کرنا وہ حماقت سمجھتا ہے اس ترک و اختیار کے فعل پر ایک نقاد اگر بحث کر سکتا ہے، تو وہ صرف اس حیثیت سے کہ جو راستہ اختیار کیا گیا ہے وہ مقصود تک پہنچانے کے لئے بہترین ہے یا نہیں؟ لیکن نفس ترک و اختیار پر کوئی اعتراض ممکن نہیں ہے۔

یہ اصل جس طرح زندگی کے جزئی معاملات پر منطبق ہوتی ہے، اسی طرح من حیث المجموع پوری زندگی پر بھی منطبق ہوتی ہے اگر انسان اپنی زندگی کا کوئی مقصد نہ رکھتا ہو، یا بالفاظ دیگر جینے سے اس کا مقصود محض جینا ہو تو وہ آزاد ہے کہ زندگی بسر کرنے کا جو طریقہ چاہے اختیار کرے۔ اس کے لئے طریقوں کے درمیان اچھے اور بُرے صحیح اور غلط، اعلیٰ اور اسفل کا امتیاز محض بے معنی ہے۔ وہ اپنی خواہشات اور حاجات کو جس طرح چاہے پورا کر سکتا ہے۔ بیرونی اسباب کسی حد تک اسے ایک خاص طریقہ کی پابندی پر مجبور بھی کریں، تو یہ اس کی زندگی کو

کسی نظم اور ضابطہ کے تحت لانے میں کارگر نہیں ہو سکتے کیونکہ انضباط کا کوئی مبدا و محرک خود اس کے اپنے نفس میں موجود نہ ہوگا۔ بخلاف اس کے اگر وہ اپنے پیش نظر زندگی کا کوئی مقصد رکھتا ہو، یا زیادہ صحیح الفاظ میں زندگی کے حیوانی طبیعی مقصد سے بالاتر کوئی عقلی انسانی مقصد اس کے ذہن میں جاگزیں ہو، تو لازماً وہ طریقوں کے درمیان امتیاز کریگا اور اگر حقیقت میں وہ ایک صاحب عقل انسان ہے تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ زندگی بسر کرنے کے مختلف طریقوں میں سے کسی ایک طریقہ کو جو اس کے مقصد کی تحصیل کے لئے زیادہ مناسب ہو اختیار کرلے۔ ایک مقصد متعین کر لینے کے بعد طریقوں میں وہی آزادی برتنا جو صرف ایک بے مقصد انسان کا حق ہے، اس کے لئے کسی طرح جائز نہ ہوگا۔

اب اس قاعدہ کو ذرا وسیع کیجئے فرد کی جگہ جماعت کو لے کر دیکھیے کہ یہی قاعدہ بالکل اسی طرح مجموعہ افراد پر بھی جاری ہوتا ہے جب تک کوئی جماعت، مدنیت کے ابتدائی مدارج میں ہوتی ہے اور زندگی کے حیوانی طبیعی مقاصد سے اعلیٰ و ارفع کوئی مقصد اس کے پیش نظر نہیں ہوتا، وہ اپنے طور طریقوں میں اُسی طرح آزاد رہتی ہے جس طرح ایک بے مقصد انسان ہوا کرتا ہے مگر جب ارتقاء عقلی اور نہضت مدنی کے زیادہ اونچے مدارج پر پہنچکر اس میں ایک تہذیب پیدا ہو جاتی ہے، اور وہ تہذیب اس کے لئے اجتماعی زندگی کا کوئی عقلی مقصد متعین کر دیتی ہے۔ تو یہ ناگزیر ہو جاتا ہے کہ اس مقصد کی مناسبت سے عقاید تصورات، معاملات، اخلاق معاشرت معیشت وغیرہ کے لئے ایک خاص نظام وضع کیا جائے وہ تہذیب اپنے متبعین کو اس نظام کا پابند بنائے اور ان کے لئے اس امر کی آزادی باقی نہ رہنے دے کہ وہ اس کے دائرے میں رہتے ہوئے کسی ایسے عقیدہ یا طرز عمل کو اختیار کرلیں جو اس نظام سے خارج ہو۔

اپنے اس ضابطہ کی حفاظت میں سختی کرنا تہذیب کی فطرت کا عین مقتضا ہے۔ اس باب میں جس تہذیب کی گرفت ڈھیلی ہوگی، اور جس کی قوت ضابطہ میں ضعف اور سستی پائی جائے گی وہ کبھی زندہ نہیں رہ سکتی کیونکہ تہذیب کا وجود منحصر ہے اس کے عقیدہ اور عمل کا جو نظام اس نے وضع کیا ہے، اس کے متبعین اس کی

پابندی کریں۔ جب متبعین ہی اس کی پابندی ہی نہ ہوگی اور اس نظام سے باہر کے تصورات اور طور طریقے ان کے ذہن اور ان کی عملی زندگی پر قابض ہو جائیں گے تو تہذیب کا کوئی واقعی وجود باقی نہ رہے گا۔ لہٰذا ایک تہذیب اپنے متبعین سے اپنے وضع کردہ نظام کی پابندی کا مطالبہ کرنے، اور دوسرے خارجی نظامات سے علیحدگی پر اصرار کرنے میں بالکل حق بجانب ہے۔ نقاد اگر کچھ کلام کر سکتا ہے تو اس کے مقصد کے صحیح یا غلط ہونے پر کر سکتا ہے، یا اس پر کر سکتا ہے کہ اس مقصد کے لئے یہ خاص طریقہ مناسب ہے یا نہیں یا اس پر کر سکتا ہے کہ اس نظام کی پابندی تمام حالات میں ممکن ہے یا نہیں لیکن وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس تہذیب کو اپنے متبعین سے اپنے وضع کردہ نظام کی پابندی کا مطالبہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

پھر جب یہ قاعدہ مسلم ہو چکا ہے کہ ذہنی اور عملی زندگی کے لئے جو خاص طریقے اور مناہج متعین کئے جاتے ہیں، ان کی تعیین دراصل مقصد کی نوعیت پر مبنی ہوتی ہے اور مقاصد کے اختلاف سے طریقوں اور منہجوں کا مختلف ہونا ضروری ہے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ جو تہذیبیں اپنے مقاصد میں مختلف ہوں ان کے اعتقادی اور عملی نظامات لازمی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہونے چاہئیں۔ یہ ممکن ہے کہ وہ نظام اپنے بعض اجزاء میں باہم متشابہ ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک نظام میں بعض جزئیات دوسرے نظام سے آگئی ہوں لیکن نہ تو جزئی تشابہات سے کلی موافقت کا حکم لگایا جا سکتا ہے اور نہ جزئیات کے مستعار لینے سے کل کا مستعار ہونا لازم آتا ہے۔ اسی اصل سے دو قاعدے اور نکلتے ہیں۔

ایک یہ کہ ایک خاص مقصد رکھنے والی تہذیب کے نظام کو جانچنے کے لئے دوسری جداگانہ مقصد رکھنے والی تہذیب کے نظام کو معیار نہیں بنایا جا سکتا۔ یعنی تنقید کا یہ طریقہ درست نہیں ہے کہ یہ نظام اگر اس نظام سے مطابقت رکھتا ہے تو صحیح ہے۔ ورنہ غلط۔

دوسرے یہ کہ ایک تہذیب کو بجائے خود باقی رکھتے ہوئے اس کے اعتقادی اور عملی نظام کو دوسرے نظام سے نہیں بدلا جا سکتا اور ایک نظام کے اساسی اجزاء دوسرے نظام میں داخل کئے جا سکتے ہیں۔ جو شخص اس قسم کے

غلط ملط کو ممکن یا درست سمجھتا ہے، وہ تہذیب کے اصول سے ناواقف ہے، اور اس کے مزاج کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔

**اسلامی تہذیب کی تشکیل میں اسکے نصب العین کا حصہ**

ان مقدمات کو ذہن نشین کرنے کے بعد آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اسلامی تہذیب کو ایک بالکل جداگانہ اور مخصوص تہذیب بنانے میں اس کے نصب العین کا کیا حصہ ہے؟

پچھلے مباحث میں یہ بات پوری تفصیل کے ساتھ بیان کی جا چکی ہے کہ اسلام نے زندگی کا جو نصب العین مقرر کیا ہے وہ دوسرے ادیان اور دوسری تہذیبوں کے نصب العین سے اصلاً مختلف ہے اور یہ ابھی ثابت کیا جا چکا ہے کہ مقصد کے اختلاف سے اعتقاد و عمل کے نظام میں بنیادی اختلاف واقع ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اسلام کے نصب العین نے اس کو ایک ایسی مخصوص تہذیب بنا دیا ہے جو بنیادی طور پر دوسری تہذیبوں سے مختلف ہے، اور جس کا اعتقادی و عملی نظام، دوسرے نظامات سے اساسی اختلاف رکھتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اس نظام کے بعض اجزاء دوسرے نظامات میں بھی پائے جاتے ہوں لیکن یہاں وہ اجزاء بعینہٖ اُس حیثیت سے مندرج نہیں ہیں جس حیثیت سے وہ دوسرے نظامات میں مندرج ہیں کسی نظام میں مندرج ہونے کے بعد جزء اپنی شخصی طبیعت کو گم کر کے کل کی طبیعت اختیار کر لیتا ہے، اور جب ایک کل کی طبیعت دوسرے کل سے مختلف ہو تو لازماً اس کے ہر جزو کی طبیعت بھی دوسرے کے ہر جزو کی طبیعت سے مختلف ہوگی۔ خواہ اس کے بعض اجزاء اپنی ظاہری شکل میں دوسرے کے بعض اجزاء سے کتنی ہی مشابہت رکھتے ہوں۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے اسلام نے انسان کو دنیا میں خدا کا نائب قرار دیا ہے۔ اور اس کی زندگی کا مقصد یہ متعین کیا ہے کہ جس آقا کا وہ نائب ہے اس کی خوشنودی حاصل کرے۔ یہ مقصد چونکہ عین اس کی زندگی کا مقصد ہے، اس لئے ضروری ہے کہ اس کی زندگی کے تمام اعمال کا رخ اسی مقصد کی طرف پھر جائے، اس کے نفس اور اس کے جسم کی تمام قوتیں اسی مقصد کی راہ میں صرف ہوں۔ اس کے

خیالات، تصورات اور حرکات و سکنات پر اسی مقصد کی حکومت ہو، اس کا جینا اور مرنا، اس کا سونا اور جاگنا، اس کا کھانا اور پینا، اس کے معاملات اور تعلقات، اس کی دوستی اور دشمنی۔ اس کی معیشت اور معاشرت، غرض اس کی ہر چیز اسی ایک مقصد کے لئے ہو، اور یہ مقصد اس کے اندر اس طرح ساری و جاری ہو جائے کہ گویا وہی اس کی وہ روح ہے جس کی بدولت وہ زندہ اور متحرک ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جو شخص اپنی زندگی کا یہ مقصد رکھتا ہو، اور اسی مقصد کے لئے زندہ ہو، وہ اس شخص کی طرح زندگی بسر نہیں کر سکتا جس کے پیش نظر کوئی مقصد نہ ہو، یا اگر ہو بھی تو اس خاص مقصد سے مختلف ہو۔ یہ مقصد تو اپنی عین فطرت کے اعتبار سے انسان کو ایک عامل اور رکارکن ہستی میں تبدیل کر دیتا ہے۔ ایسا عامل اور کارکن جو زندہ ہی صرف اس لئے کہ اپنے زندگی کے مقصد کو حاصل کرے۔

پس یہ مقصد متعین کرنے کے بعد اسلام زندگی بسر کرنے کے مختلف طریقوں میں سے ایک خاص طریقہ کو انتخاب کرتا ہے اور انسان کو مجبور کرتا ہے کہ اس طریقہ کے سوا کسی اور طریقہ پر چل کر اپنے عزیز وقت اور اپنی قیمتی طاقتوں کو ضائع نہ کرے۔ وہ اس مقصد کی طبیعت و فطرت کے مطابق عقاید اور اعمال کا ایک جداگانہ نظام وضع کرتا ہے، اور انسان سے مطالبہ کرتا ہے کہ اس خاص نظام سے کسی حالت میں باہر نہ جائے۔ وہ اس نظام کو سراسر اطاعت اور عین انقیاد قرار دیتا ہے، اس لئے اس کا نام ہی "دین" رکھ دیا ہے جس کے معنی اطاعت اور انقیاد کے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ:-

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (۳ : ۲) دین اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے،

اسی دین کی بنیاد پر وہ اپنے متبعین اور غیر متبعین کے درمیان خط امتیاز کھینچتا ہے جو لوگ اس خاص مقصد کے تحت اس نظام دینی کا اتباع کرتے ہیں ان کو وہ "مسلم" (اطاعت کرنے والے) اور "مومن" (ماننے والے) کہتا ہے اور جو اس مقصد سے متفق نہیں ہیں اور اس نظام دین کا اتباع نہیں کرتے ان کو "کافر"[1] (انکار کرنے والا) قرار دیتا ہے۔ وہ نسل، قوم، زبان، وطن، اور ایسے ہی دوسرے تمام

[1] لفظ کافر کے استعمال میں بھی بے نظیر بلاغت سے کام لیا گیا ہے۔ لغت عرب میں "کفر" کے معنی چھپانے کے ہیں

امتیازات کو مٹا کر اولاد آدم میں صرف اسی ایک کفر و ایمان کے امتیاز کو قائم کرتا ہے۔ جو کوئی اس کے نظام کا اتباع کرے وہ اس کا اپنا ہے، خواہ وہ مشرق میں ہو یا مغرب میں۔ اور جو اس کے نظام کا اتباع نہ کرے وہ غیر ہے، خواہ وہ عین کعبہ کی دیوار ہی کے نیچے کیوں نہ رہتا ہو اور اس کی ہڑی بوٹی مکہ کی کھجوروں اور زمزم کے پانی ہی سے کیوں نہ بنی ہو۔

جس طرح اس نے عقائد اور اعمال کی بنا پر انسانوں کے درمیان "کفر" اور "ایمان" کا امتیاز قائم کیا ہے، اسی طرح زندگی بسر کرنے کے طریقوں اور دنیا کی تمام چیزوں کے درمیان بھی اس نے حرام اور حلال جائز اور ناجائز، مکروہ اور مستحسن کا امتیاز قائم کیا ہے۔ جو اعمال اور طور طریقے اس مقصد کی تحصیل اور فرائض خلافت کی بجا آوری میں مددگار ہیں وہ اپنے درجہ کے لحاظ سے مستحسن ہیں یا حلال ہیں یا جائز اور جو اس میں مزاحم اور مانع ہیں وہ اپنے مرتبہ کے لحاظ سے مکروہ ہیں یا ناجائز یا حرام۔ جو مومن اس خط امتیاز کا احترام کرے وہ "متقی" (پرہیز گار) ہے اور جو اس کا احترام نہ کرے وہ "فاسق" (حدود سے نکل جانے والا) ہے اللہ کی پارٹی کے لوگوں میں ادنیٰ اور اعلیٰ کا امتیاز، مال و دولت، یا حسب و نسب، یا مراتب معاشرت یا رنگ کی سیاہی و سپیدی پر مبنی نہیں ہے، بلکہ صرف "تقویٰ" کی بنا پر ہے۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (۴۹: ۲)

اس طرح تصورات و افکار، اخلاق و خصائل، معیشت و معاشرت، تمدن و عمران، سیاست و حکومت غرض انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں اسلامی تہذیب کا راستہ دوسری تہذیبوں کے راستہ سے الگ ہو جاتا

---

بقیہ حاشیہ صفحہ (۱۷)، اسی لئے رات کو "کافر" کہا جاتا ہے کہ وہ چیزوں کو چھپا دیتی ہے۔ اور کسان کو بھی کافر کہتے ہیں کہ وہ بیج کو زمین میں چھپا دیتا ہے اور خوشہ کو کافور کہتے ہیں کہ وہ پھل کو اپنے اندر چھپا لیتا ہے پھر استعارہ کے طور پر نعمت کے چھپانے اور اس کا شکر ادا نہ کرنے کو "کفر" اور "کفران" کہا گیا۔ اسلام نے اس لفظ کو ایمان کی ضد قرار دیا ہے جس سے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ جو لوگ اسلام قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں وہ در اصل اپنی فطرت اور جبلت پر پردہ ڈالتے ہیں۔

ہے زندگی کے متعلق اسلام کا نظریہ دوسری تہذیبوں کے نظریہ سے الگ ہے۔ زندگی کا مقصد اسلام کے نزدیک
اس مقصد سے مختلف ہے جو دوسری تہذیبوں نے متعین کیا ہے۔ لہذا اسلام اپنے نظریہ کے مطابق دنیا اور ما فیہا
سے جو معاملہ برتتا ہے، اور اپنے مقصد کی تحصیل کے لئے دنیوی زندگی میں جو طریقہ اختیار کرتا ہے، وہ بھی بنیادی
طور پر اس معاملہ اور اس طریقہ سے مختلف ہے جو دوسری تہذیبوں نے اختیار کیا ہے، ذہن کے بہت سے افکار
و تصورات، نفس کے بہت سے میلانات و رجحانات اور زندگی بسر کرنے کے بہت سے طریقے ایسے ہیں جن کا اتباع
دوسری تہذیبوں کے نزدیک نہ صرف جائز بلکہ بسا اوقات لازمۂ تہذیب ہے۔ مگر اسلام ان کو ناجائز، مکروہ
اور بعض حالات میں حرام قرار دینے پر مجبور ہے۔ اس لئے کہ وہ اُن تہذیبوں کے تصور حیات سے عین مطابقت
رکھتے ہیں اور اُن کے مقصد زندگی کی تحصیل میں مددگار ہوتے ہیں، مگر اسلام کے تصور حیات سے ان کو کوئی لگاؤ
نہیں، اور اس کے مقصد زندگی کی تحصیل میں وہ مانع ہیں۔ مثال کے طور پر فنون لطیفہ دنیا کی بہت سی تہذیبوں میں
جان تہذیب ہیں۔ اور ان فنون میں اعلیٰ مہارت رکھنے والوں کو قومی ہیرو کا مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے۔ مگر اسلام
ان میں سے بعض کو حرام بعض کو مکروہ اور بعض کو ایک حد تک جائز قرار دیتا ہے۔ اس کے قانون میں ذوق
لطیف کی پرورش، اور جمال مصنوعی سے لطف اندوزی کی اجازت صرف اس حد تک ہے جہاں انسان اس
کے ساتھ ساتھ خدا کو یاد رکھ سکے۔ اس کی رضا جوئی کے لئے عمل کر سکے۔ اپنے منصب خلافت کے فرائض بجا لا سکے
مگر جس مقام پر پہنچ کر یہ ذوق لطیف، احساس فرض پر غالب آجاتا ہو، جہاں لطف اندوزی کا انہماک انسان
کو خدا پرست کے بجائے حسن پرست بنا دیتا ہو جہاں فنون لطیفہ کی چاشنی سے انسان کو عیش پسندی کا چسکا لگ
جاتا ہو۔ جہاں ان فنون کے اثر سے جذبات و داعیات نفس اس قدر قوت و شدت حاصل کر لیتے ہوں کہ
عقل کی گرفت ڈھیلی ہو جائے ضمیر کی آواز کیلئے دل کے کان بہرے ہو جائیں، اور فرض کی پکار کے لئے سمع و
طاعت باقی نہ رہے، تو اس سرحد پر اسلام عدم جواز، کراہت اور حرمت کے موانع قائم کر دیتا ہے اس لئے
کہ اس کا مقصد تان سین اور بہزاد پیدا کرنا نہیں، مانی اور بہزاد، چارلی چیپلن، اور میری پکفورڈ پیدا کرنا نہیں ہے۔

بلکہ وہ ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ علی بن ابی طالبؓ اور حسین ابن علیؓ ابوذر غفاریؓ اور رابعہ بصریہ پیدا کرنا چاہتا ہے
یہی حال معاشرت اور تمدن کے اور بہت سے معاملات میں بھی ہے جن کی تفصیلات کو اوپر کی مثال پر قیاس کیا جا سکتا ہے خصوصیت کے ساتھ عورتوں اور مردوں کے تعلقات، مالدار اور مفلس کے معاملات راعی اور رعیت کے روابط اور انسانی طبقات کے باہمی برتاؤ کے متعلق اسلام کا طریقہ تمام قدیم اور جدید تہذیبوں کے طریقہ سے اصولی طور پر مختلف ہے۔ اس باب میں دوسری تہذیبوں کے نظام کو معیار قرار دینا اور اسلام کے نظام کو اس پر جانچنے کی کوشش کرنا اصلاً غلط ہے۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ سطح بین اور حقیقت نا آشنا ہیں۔

(باقی)

---

# دنیا قرآنی دنیا کب ہوگی؟

اے حاکم مطلق خدا! تیری وہ شانِ حاکمیت کب ظاہر ہوگی جبکہ روئے زمین کے سارے حکمران اور ان کی ساری رعیت تیرے حکموں پر چلے گی، تیرے آسمانی قوانین پر سر جھکائے گی اور صرف تیری حکومیت کا دم بھرے گی؟

اے معبود مطلق خدا! وہ وقت کب آئے گا جبکہ ہر فرد انسان تیری اور صرف تیری پرستش و عبادت اور صرف تیری عبادت کرتا نظر آئے گا؟

اے سراپا جمال خدا! آخر وہ جلوہ نمائی کب ہوگی جبکہ بنی آدم کو تیری اور فقط تیری محبت ہوگی اور ان کے پاس جو کچھ ہوگا وہ سب تجھ پر نثار کرنے کے لئے ہوگا؟

اے میرے خدا! دنیا قرآنی دنیا کب ہوگی؟ کیونکہ جو کچھ ہو سکتا ہے۔ وہ تیری اسی پاک کتاب کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے۔

"مصلح"

# ظل و نور

از جناب ذوقی شاہ صاحب

---

انسان جب اپنے اصلی رنگ میں ہوتا ہے تو اپنی ہی بولی بولتا ہے، ہر فن میں کلام کرنے والا جب اپنے فن میں کلام کرتا ہے تو اسی زبان میں مقید رہتا ہے جو اس فن کے لئے مختص ہے۔ ایک معمولی شخص معمولی طور پر یہی کہیگا کہ "زید کو اس وقت تیز بخار ہے" مگر ایک ڈاکٹر جب اپنی زبان میں بات کریگا تو یوں کہیگا کہ "زید کا ٹمپریچر اس وقت ایک سو پانچ ہے"۔ الفاظ بظاہر مختلف مگر بباطن ہم معنی ہیں۔ اگر فرق ہے تو بس اسی قدر کہ پہلے فقرہ میں اجمال ہے اور دوسرے میں کسیقدر تفصیل۔

ایک دوست کے اصرار پر میں بھی اس وقت "ظل و نور" کے متعلق صوفیانہ رنگ میں مختصراً کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ تصوف کے مضامین کا حق تصوف ہی کی زبان کچھ ادا کر سکتی ہے ممکن ہے کہ بعض ناظرین میرے اس مضمون کو چیستان سے زیادہ وقعت نہ دیں لیکن غور و خوض کرنے والی طبیعتیں یقیناً اس سے محظوظ ہوں گی اور پانے والی بات کو پالیں گی۔

ظہور کائنات سے قبل ایک زمانہ تھا جس پر نہ زمانہ کا اطلاق ہوتا تھا نہ وقت کا۔ اس وقت نہ زمان تھا نہ مکان۔ نہ ازل نہ ابد۔ نہ تحت نہ فوق نہ ارکان تھے نہ عناصر۔ صرف ذات مطلق تھی اور کچھ نہ تھا۔ کَانَ اللّٰہُ وَلَمْ یَکُنْ مَعَہٗ شَیْئًا۔

تخلیق کائنات کی جب پوپھٹی، ظہور کائنات کا جب آفتاب طلوع ہوا، تو جملہ اشیاء عدم سے وجود میں آئیں۔ اشیاء کو ظلمتِ عدمی سے نورِ وجود کی جانب لانے ہی کا نام تخلیق ہے۔ صوفیاء کرام کی

اصطلاح میں جملہ ظہورات وتعینات کو، وجود اضافی کو جو اعیانِ ممکنات تعینات کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے، معدومات ظاہرہ کو جو انوار الٰہی کی چمک سے ظہور پکڑتے ہیں، ظل سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور نور وہ روشنی وہ چمک وہ قوت، وہ قدرت ہے جس سے یہ معدومات وجود میں آکر ظاہر ہوتے ہیں۔ نور ایک اسم ہے اسماء الٰہی میں سے جو تقریباً مترادف ہے۔ اسم الظاہر کے احکام ممکنات جو در اصل معدومات سے ہیں۔ اسم نور سے ظاہر ہوئے۔ اس ظہور کو وجود اضافی اور وجود خارجی کہتے ہیں۔ یہ اضافی یا خارجی وجود معدومات میں ظلمتِ عدمی ہے وہ نور جو صور معدومات میں ظاہر ہوا ظل ہے۔ کیونکہ موہوم ہے اور منقول ہے اور نفی نفسہا معدومات کی عدمیت ہے۔ تو گویا جن معدومات کا ظہور ہوا۔ وہ بھی ظل ہیں۔ اور جس نور کے سبب ان کا ظہور ہوا وہ نور بھی ظل ہے۔

عالم کو حق تعالیٰ سے وہی نسبت ہے جو سایہ کو اس شخص سے ہے جس کا کہ وہ سایہ ہے۔ عالم جس کہ غیر حق کا اطلاق ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کا ظل ہے۔ یہ ظل الٰہی جسے کہ عالم کہتے ہیں اعیان ممکنات میں ظاہر اور ممتد ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سورہ فرقان میں فرماتا ہے۔ اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّکَ کَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ۔ کیا تو نے اپنے رب کی طرف نظر نہیں کی کہ اس نے وجود اضافی کو ممکنات پر کس طرح پھیلایا؟ وَلَوْ شَاءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا۔ اور اگر وہ چاہے تو اس کو ساکن کر دے یعنی وجود اضافی کو اپنی ذات میں بالفعل سے بالقوہ کر دے۔ گویا حق تعالیٰ کی ہستی ایسی نہیں کہ جب وہ ممکنات میں تجلی فرماوے تب ظاہر ہو اور تجلی نہ فرمانے کی صورت میں مثل ممکنات کے ہو جاوے جن کا کوئی عین ہی وجود میں ظاہر نہیں۔ ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيلًا۔ پھر ہم نے اس سایہ پر آفتاب کو دلیل و رہنما بنایا۔ آفتاب سے ظل نمائی ظہور میں نہ آتی تو آفتاب کی روشنی کو کوئی نہ پہچانتا۔ اگر آفتاب ایک ہی حالت پر قائم رہتا اور صبح شام نہ ہوتی اور سایہ کی طوالت میں کمی بیشی نہ واقع ہوتی رہتی تو نہ کسی کو نور کا شعور ہوتا نہ کوئی اس نور کو آفتاب سے نسبت دیتا۔ گویا آفتاب کے نور سے سایہ پہچانا جاتا ہے۔ اور سایہ سے آفتاب کا نور۔ وہ آفتاب اسم نور ہے جس سے وجود ظلی

کی شناخت ہوتی ہے۔ ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَیْنَا قَبْضًا یَّسِیْرًا۔ پھر ہم اس کو اپنی طرف تھوڑا تھوڑا اور آہستہ آہستہ کر کے لیتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ وہ اسی کا ظل ہے اور اسی کی طرف جملہ امور پلٹتے ہیں۔ کیونکہ وہ ہر چیز کی اصل ہے پس جملہ تعینات باعتبار ہویت حق کے حق تعالیٰ ہی کا وجود ہے اور باعتبار صورتوں کے اختلاف کے وہ سب تعینات اعیان ممکنات ہیں۔ جس طرح صورتوں کے اختلاف سے ظل کا نام اس سے دور نہیں ہو سکتا اسی طرح اس اختلاف کی بنا پر عالم اور غیر حق کے نام بھی اس سے دور نہیں ہو سکتے۔

جب عالم ایک ظل یا مجموعۂ ظلال ہے تو عالم کا وجود اصلی نہیں بلکہ ظلی وہمی خیالی اور اعتباری ہے حقیقت سے ناواقف خیال کرتا ہے کہ عالم حق تعالیٰ سے خارج ایک شئے زاید ہے، نیز یہ کہ عالم قائم بنفسہ ہے حالانکہ دراصل ایسا نہیں۔ سایہ کو اصل سے جو اتصال ہے اس کا ٹوٹنا محال ہے۔ کوئی چیز سایہ کو اصل سے جدا نہیں کر سکتی۔ ہر شخص اپنے عین کو پہچاننے کی کوشش کرے تو اسے معلوم ہو جائیگا کہ وہ کون ہے؟ اوس کی ہویت کیا ہے؟ کس اعتبار سے اس پر کون سا اسم صادق آتا ہے؟ جہت حق اس کی کونسی ہے اور جہت خلق کونسی؟ اس معرفت کی کمی و بیشی پر عارفوں کی بصیرت کی کمی و بیشی کا تفاوت ہے اس کمی و بیشی کی مثال یہ ہے کہ ایک آئینہ خانہ متصور کرو جس میں بےشمار چھوٹے اور بڑے سیدھے اور ٹیڑھے صاف اور دھندلے، سپید اور رنگ برنگ کے آئینے ٹکے ہوئے ہیں۔ جن پر ایک ہی رنگ کی روشنی پھینکی جارہی ہے۔ دیکھنے والے کی نگاہ میں آئینہ کی رنگت اور صورت کے مطابق وہ روشنی بھی رنگ و صورت اختیار کر لیتی ہے۔ حالانکہ اس روشنی کا اصلی رنگ و صورت وہ نہیں۔ چھوٹے آئینے میں چھوٹی اور بڑے آئینہ میں بڑی صورت نظر آتی ہے۔ سیدھے میں سیدھی اور ٹیڑھے میں ٹیڑھی۔ صاف آئینہ میں صاف اور دھندلے میں دھندلی نظر آتی ہے۔ اسی طرح جو بندہ بوجہ اپنی صفائی کے حق تعالیٰ کے ساتھ زیادہ متحقق ہو جاتا ہے اس میں حق تعالیٰ کے مظاہر زیادتی کے ساتھ نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ اللہ کے ایسے بندے بھی ہیں کہ حق تعالیٰ ان کے لئے سمع و بصر و کلام اور کل قویٰ وجوارح بن جاتا ہے

لیکن باوجود اس قرب و اتصال کے بندہ ظلّ ہی رہتا ہے۔ یہ بندہ بوجہ اپنی صفائی کے ایک ایسا شیشہ ہوتا ہے کہ اسے ظلّ نوری کہتے ہیں ہر شخص بوجہ ظلّ ہونے کے محض خیال ہوتا ہے اور اس بندہ کے جملہ مدرکات اور یہ تمام موجودات جس پر غیر حق کا اطلاق ہوتا ہے۔ خیال در خیال ہے۔ وجود حق باعتبار اپنی ذات وعینیت کے اللہ ہی ہے نہ کہ باعتبار اسمار کے جن میں کثرت ہے ہستی میں احدیت ہے اور خیال میں کثرت جو کثرت میں قائم رہا وہ عالم میں اسمار الہیہ اور اسمار کونیہ کا قرین رہا اور جو احدیت پر قائم رہا اسے اس ذات اقدس کی معیت حاصل ہوئی جو غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِيْنَ ہے یہ استغنار اسمار سے بھی ہے اور مسمّیات سے بھی۔ اللہ تعالیٰ کی وہ احدیت جو باعتبار اسمار الہیہ کے ہے احدیت الکثرت کہلاتی ہے۔ اور وہ احدیت جو ان اسمار سے مستغنی ہونے کی جہت سے ہے احدیت عینی کہلاتی ہے۔ ان دونوں جہتوں پر اسم احد کا اطلاق ہوتا ہے ۔

ظلال ہی کی بدولت اور ظلال کے داہنے بائیں کردیں لینے کے سبب سے بندہ کی رہنمائی ہوتی ہے اور بندہ پہچاننے لگتا ہے کہ اس کو حق تعالیٰ سے اور حق تعالیٰ کو اس سے کیا نسبت ہے؟ ماسوا کیوں فقر و ناداری و پستی سے متصف ہے اور حقیقت الہیہ کی جانب اسے کیونکر احتیاج کلی ہے؟ اور حق تعالیٰ کے لوگوں اور عالموں سے مستغنی ہونے کی کیا حقیقت ہے؟

عالم اللہ کا محتاج ہے بسبب اسمار الہیہ کے۔ اور اسمار الٰہی وہ اسمار ہیں جن کے تحت میں عالم کے لوگ اور عالم کی چیزیں باہم ایک دوسرے کی محتاج ہیں یا عین ذات حق تعالیٰ کی محتاج ہیں کیونکہ ہمارے اسمار یا ہماری ذات بھی اللہ ہی کے اسمار ہیں۔ اور ہمارے اعیان نفس الامر میں اسی کے ظلّ ہیں۔ اور اس کے غیر نہیں۔ باعتبار حقیقت کے وہ ہماری ہویّت ہے لیکن باعتبار تقید کے وہ ہماری ہویت نہیں لہٰذا وہ مِن وجہٍ بندہ کی ہویّت ہے اور مِن وجہٍ بندہ کی ہویت نہیں۔

اب ذرا آیت نور کی بھی سیر فرمایئے جس کو اس مضمون سے قوی تعلق ہے:۔

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ۭ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ۭ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْۗءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ۭ نُوْرٌ عَلٰي نُوْرٍ ۭ يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۔ (النور ع ۵)

اللہ نور ہے آسمانوں کا اور زمین کا۔ اس کے نور کی مثال مانند طاق کے ہے جس کے بیچ میں چراغ ہو۔ وہ چراغ شیشہ کی قندیل میں ہے شیشہ کی وہ قندیل گویا کہ تارہ ہے چمکتا ہوا روشن کیا جاتا ہے۔ وہ چراغ زیتون کے مبارک درخت سے جو نہ شرقی ہے نہ غربی۔ نزدیک ہے کہ تیل اس کا روشن ہو جاوے۔ اگرچہ نہ لگے اس کو آگ۔ نور پر نور ہے اللہ جسے چاہتا ہے اپنے نور کی جانب ہدایت فرماتا ہے۔ اور بیان فرماتا ہے مثالیں واسطے لوگوں کے اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے:۔

سمٰوٰت سے یہاں ارواح مراد ہیں اور ارض سے اجساد۔ مشکوٰۃ جسم انسانی ہے۔ مصباح روح ہے۔ جو مثل چراغ کے روشن اور روشن کنندہ ہے۔ زجاجہ قلب عبد ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نور وجود سے آسمانوں اور زمین کا اشراق فرمایا بعد اس کے کہ جو حجابات اس کے اور ان کے درمیان تھے انھیں وہ اٹھا چکا تھا۔ حجابات کے اٹھا دینے سے یہ مراد ہے کہ آسمانوں میں اور زمین میں اور جو کچھ ان میں ہے ان میں اللہ تعالیٰ نے اپنا نور قبول کر لینے کی صلاحیت پیدا فرما دی جس طرح کہ آئینہ میں صیقل کر دینے سے صورتوں کے قبول کرنے کی آئینہ میں صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے

اللہ تعالیٰ کے نور کے اس عالم میں ہونے کی مثال ایسی ہے جیسے کہ روح انسانی بدن انسانی میں مصباح یعنے روح ہے۔ یہ روح قلب یعنے زجاجہ میں ہے شجرۂ مبارکہ سے نفس انسانی مراد ہے انواع واقسام کے فیوض قبول کرنے کی قابلیت۔ لاشرقیۃ سے اشارہ ہے عالم مجردات کی جانب

نیز یہ اشارہ بھی ہے کہ اس میں کمالات بالفعل ہیں۔ اور لا غربیۃ سے مراد ہے کہ وہ اجسام کثیفیہ، ظلمانیہ میں سے نہیں۔ یکاد زیتہا سے یہ مراد ہے کہ اس میں خود ہی چمک اٹھنے کی استعداد موجود ہے ولو لم تمسسہ نار یعنی حرارت غریزہ کا روح انسانی کے ساتھ کوئی مدبرانہ تعلق نہ ہو۔ نورٌ علیٰ نور سے وہ نور مراد ہے۔ جو اس نور انسانی کے مافوق ہے اور وہ نور الٰہی ہے۔ یھدی اللہ لنورہ من یشاء اللہ تعالیٰ ہی جسے چاہتا ہے اس نور کی جانب رہنمائی فرماتا ہے۔ یہ کسی اور کے بس کی بات نہیں ویضرب اللہ الامثال للناس ۔ یہ صرف مثالیں ہیں جو لوگوں کے لئے اس غرض سے بیان کی گئی ہیں کہ حقیقت حال تک پہنچنے میں لوگوں کو ذرا مدد ملے ورنہ حقیقت تو ان سے ماوریٰ ہے۔ واللہ بکل شئی علیم۔ اور ہر قسم اور چیز کے پورے پورے علوم یعنی جمیع علوم ظاہری و باطنی کا خزانہ حق تعالیٰ ہی کے پاس ہے وہ اس میں سے جتنا جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔

---

جن حضرات کی مدت خریداری ماہ جمادی الاخریٰ میں ختم ہو رہی ہے ان میں سے بعض ایسے ہیں جنہوں نے مجلس تحریک قرآن کی امداد کے لئے اس رسالہ کا چندہ گزشتہ سال دس روپے ادا کیا تھا۔ اگر وہ چاہیں تو اپنی امداد کو آئندہ سال کے لئے بھی جاری رکھ سکتے ہیں۔ ان کے چندہ میں سے پانچ روپے رسالہ کی قیمت میں وضع کر کے باقی پانچ مجلس تحریک قرآن کو بھیج دئے جائینگے جس کی باقاعدہ رسید مجلس کے دفتر سے ان کو پہنچ جائیگی

منیجر

# گوسالۂ سامری

از

مولنا عبداللہ العمادی

(۴)

یہ سچ ہے کہ قوم سامرتین کا زمانہ حضرت موسیٰ کے ہم عہد نہیں لیکن کیا ایک نام کا ایک ہی شخص ہوا کرتا ہے؟ تورات میں سامر کا نام کئی جگہ آیا ہے[1]۔ ممکن ہے تغیر لہجہ سے عبری کا سامر عربی میں سامری بن گیا ہو لیکن اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ سامری قوم سامرہ ہی کا ایک فرد تھا جب بھی کوئی مضایقہ نہیں۔ سید احمد خان لکھتے ہیں۔

"بنی اسرائیل کے بارہ سبط تھے اور سب ایک سلطنت کے ماتحت تھے۔ مگر جب رحبعام بادشاہ ہوا تو بنی اسرائیل کے دس سبط نے اس سے بغاوت کی اور یار بعام پسر نباط کو اپنا بادشاہ بنایا۔ اس نے اپنے ملک میں بمقام بیت ایل اور دان کے سونے کے بچھڑے بنائے (دیکھو اول سلاطین باب ۱۲۔ آیت ۲۸ و ۲۹) اور ان کی پرستش شروع کی۔ جب کہ عمری ان لوگوں پر بادشاہ ہوا تو اس نے کوہ شومون کو اس کے مالک سے جس کا نام شمر تھا خرید لیا۔ (سلاطین میں بجائے شمر کے سامر لکھا ہے) اور وہاں شہر بنایا جو دار الخلافہ ہو گیا۔ (دیکھو اول سلاطین۔ باب ۱۶۔ آیت ۲۳ لغایۃ ۲۵) اور اسی سبب سے وہ لوگ سمارتن یا شامری یا سامری مشہور ہوئے۔ وہ قوم جس میں کے ایک شخص نے بنی اسرائیل کے لئے بچھڑا بنایا تھا قرآن مجید کے بہت پہلے سے سامری کے نام سے کہلاتی تھی قرآن مجید میں السامری کہنے سے صرف یہ اشارہ ہے کہ اس کا بنانے والا اس قوم میں سے تھا جنہوں نے آخر کار یار بعام کی اطاعت کر کے سونے کے بچھڑوں کی پرستش کی تھی

---

[1] اخبار الایام (اول تواریخ) باب ۷، آیت ۳۴ و باب ۸۔ آیت ۱۲۔

اور جو لوگ سامری یعنی سامرتن کے لقب سے مشہور ہیں۔

(۵)

اس واقعہ کے متعلق توراۃ کا بیان حسب ذیل ہے :۔

"جب لوگوں نے دیکھا کہ موسیٰ پہاڑ سے اترنے میں دیر کرتا ہے تو وہ ہارون کے پاس جمع ہوئے اور اُسے کہا کہ اُٹھ۔ ہمارے لئے معبود بنا کہ ہمارے آگے چلیں کیونکہ یہ مرد موسیٰ جو ہمیں مصر کے ملک سے نکال لایا۔ ہم نہیں جانتے کہ اسے کیا ہوا۔ ہارون نے کہا کہ سونے کے زیور جو تمہاری بیویوں بیٹوں اور بیٹیوں کے کانوں میں ہیں اُتار اُتار کے میرے پاس لاؤ۔ چنانچہ سب لوگ زیوروں کو جو ان کے پاس تھے اُتار اُتار کے ہارون کے پاس لائے۔ اس نے ان کو ہاتھوں سے لیا۔ اور ایک بچھڑا ڈھال کر اس کی صورت حکاکی کے اوزار سے درست کی۔ انہوں نے کہا کہ اے بنی اسرائیل یہ تمہارا معبود ہے جو تمہیں مصر سے نکال لایا جب ہارون نے یہ دیکھا تو اس کے آگے ایک قربان گاہ بنائی۔ ہارون نے یہ کہکر منادی کی کہ کل خداوند کے لئے عید ہے۔ وہ صبح کو اٹھے اور سوختنی قربانیاں چڑھائیں۔ سلامتی کی قربانیاں گزرانیں لوگ کھانے پینے کو بیٹھے اور کھیلنے کو اٹھے۔ تب خداوند نے موسیٰ کو کہا کہ اتر جا کیونکہ تیرے لوگ جنھیں تو مصر کے ملک سے چھڑا لایا خراب ہو گئے ہیں۔ وہ اس راہ سے جو میں نے انہیں فرمائی جلد پھر گئے ہیں۔ انہوں نے اپنے لیئے ڈھلا ہوا بچھڑا بنایا۔ اسے پوجا اور اس کے لئے قربانی ذبح کر کے کہا اے اسرائیل یہ تمہارا معبود ہے۔ پھر خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ میں اس قوم کو دیکھتا ہوں کہ ایک گردن کش قوم ہے۔ اب تو مجھ کو چھوڑ کہ میرا غضب ان پر بھڑکے۔ اور میں ان کو بھسم کروں میں تجھ سے ایک بڑی قوم بناؤنگا موسیٰ نے اپنے خداوند خدا کے آگے منت کر کے کہا کہ اے خداوند کیوں تیرا غضب اپنے لوگوں پر جنھیں تو شہزوری اور زبردستی کے ساتھ ملک مصر سے نکال لایا بھڑکتا ہے ...... تب خداوند اس بدی سے جو اس نے سوچا تھا۔ کہ اپنے لوگوں سے کرے پچھتایا۔ موسیٰ پھر کر پہاڑ سے اتر گیا شہادت کی دو نوں لوحیں اس کے ہاتھ میں تھیں۔ جو لکھا ہوا سو خدا کا لکھا ہوا اور ان پر کندہ کیا ہوا تھا جب یشوع نے

لوگوں کی آواز جو پکار رہے تھے سنی تو موسیٰ سے کہا کہ لشکر گاہ میں لڑائی کی آواز ہے۔ موسیٰ بولا "یہ تو نہ فتح کے شور کی آواز نہ شکست کے شور کی آواز ہے بلکہ گانے کی آواز میں سنتا ہوں"۔ جب وہ لشکر گاہ کے پاس آیا اور بچھڑا اور ناچ راگ دیکھا تب موسیٰ کا غضب بھڑکا اس نے لوحیں اپنے ہاتھوں سے پھینکدیں۔ پہاڑ کے نیچے توڑ ڈالیں۔ اس بچھڑے کو جسے انہوں نے بنا یا تھا لیا۔ اس کو آگ سے جلایا۔ پیسکر خاک سا بنا یا اور اس کو پانی پر چھڑک کر بنی اسرائیل کو پلایا۔ موسیٰ نے ہارون سے کہا کہ ان لوگوں نے تجھ سے کیا کیا کہ تو ان پر ایسا بڑا گناہ لایا۔ ہارون نے کہا کہ میرے خداوند کا غضب نہ بھڑکے۔ تو اس قوم کو جانتا ہے کہ بدی کی طرف مائل ہے سو انہوں نے مجھے کہا کہ ہمارے لئے ایک معبود بنا جو ہمارے آگے چلے کہ یہ مرد موسیٰ جو ہمیں مصر کے ملک سے چھڑا لایا ہم نہیں جانتے کہ اسے کیا ہوا تب میں نے انہیں کہا کہ جس کے پاس سونا ہو وہ اتار لائے۔ انھوں نے مجھے دیا اور میں نے اسے آگ میں ڈالا سو یہ بچھڑا نکلا جب موسیٰ نے لوگوں کو دیکھا کہ وہ بے قید ہو گئے۔ کہ ہارون نے انھیں ان کے مخالفوں کے روبرو اُن کی رسوائی کے لئے بے قید کر دیا تھا تب موسیٰ لشکر گاہ کے دروازے پر کھڑا ہوا اور کہا جو خداوند کی طرف ہو وہ میرے پاس آئے۔ تب سب بنی لاوی اس کے پاس جمع ہوے۔ اس نے انہیں کہا کہ خداوند اسرائیل کے خدا نے فرمایا ہے کہ تم میں سے ہر مرد اپنی کمر پر تلوار باندھے۔ ایک دروازے سے دوسرے دروازے تک تمام لشکر گاہ میں گذرتے پھرو۔ ہر مرد تم میں سے اپنے بھائی کو اور ہر ایک آدمی اپنے دوست کو اور ہر ایک شخص اپنے عزیز قریب کو قتل کرے۔ بنی لاوی نے موسیٰ کے کہنے کے موافق کیا۔ چنانچہ اس دن لوگوں میں سے قریب تین ہزار کے مارے پڑے۔۔۔۔ دوسرے دن صبح کو یوں ہوا کہ موسیٰ نے لوگوں سے کہا کہ تم نے بڑا گناہ کیا۔ اب میں خداوند کے پاس اوپر جاتا ہوں۔ شاید میں تمہارے گناہ کا کفارہ کروں۔۔۔

خداوند نے ان کے بچھڑے بنانے کے سبب سے جسے ہارون نے بنایا تھا۔ لوگوں پر طاعون بھیجا[1]"

[1] خروج باب ۳۲۔ آیت اول لغایتہ ۳۵۔

(۶)

تورات کا افسانہ اگر صحیح ہے تو اس کے لازمی نتائج یہ ہوں گے :-

**الف** - بچھڑے کا بنانے والا سامری نہ تھا - خود حضرت ہارون اس کے بنانے والے تھے -

(ب) ہارون کو خدا نے مقدس بنایا تھا - تقدس کا خلعت دیا تھا - روحانی نعمتیں عنایت کی تھیں نسلاً بعد نسلٍ ان کے خاندان میں اس تقدس کو قائم رکھنے کا وعدہ کیا تھا - حضرت موسیٰ کو ان کے (یعنی ہارون کے) اور ان کی اولاد کے متعلق بہت سی وصیتیں کی تھیں[1] - بایں ہمہ نہ تو ہارون نے خدا کی رحمتوں کا خیال کیا اور نہ اپنے فرائض پر نظر کی - حضرت موسیٰؑ نے انہیں اپنا قائم مقام مقرر کیا تھا مگر بجائے اس کے کہ وہ عوام کو گمراہی سے بچاتے خود ہی اس کی بنیاد قائم کر دی -

(ج) لازم تو یہ تھا کہ بنی اسرائیل پر خدا نے جس قدر عذاب نازل کیا تھا اس سے بہت زیادہ عذاب ہارون پر نازل ہوتا - اس لئے کہ یہی حضرت اس گمراہی کے بانی تھے لیکن بیچارے عامیوں سے تو اتنا سخت بدلہ لیا گیا کہ سب لوگ اپنے عزیز ترین دوستوں اور رشتہ داروں کو قتل کرنے اور کٹ مرنے پر مجبور کئے گئے مگر ہارونؑ کا بال تک بیکا نہ ہوا اور مواخذہ تو درکنار خدا کی جانب سے انھیں تنبیہ بھی نہیں کی گئی -

(د) تورات کے بیانات قابل تسلیم نہیں ہیں اس لئے کہ جا بجا ہارونؑ کی عظمت بھی بیان کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ عظمت ہارون کے خاندان میں قائم رہے گی - اور پھر یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ خدائے اسرائیل نے بنی اسرائیل کی ہدایت و اصلاح کے متعلق ان پر جو اعتماد کیا تھا وہ حق بجانب نہ تھا - کیونکہ ایک وقت میں انھوں نے حد درجہ کی شرک و گمراہی میں حصہ لیا تھا - خود بھی گمراہ ہوئے تھے - اور تمام قوم کو بھی ضلالت میں پھنسایا تھا -

[1] - خروج باب ۲۸ - از اوّل تا آخر -

یہ وہ نتائج ہیں جن سے ممکن ہے کہ سرسری نظر والی خوش اعتقاد طبیعتوں میں کوئی تذبذب نہ پیدا ہو لیکن حقیقت شناسی کا وجود اگر دنیا میں باقی ہے تو ہارونؑ کی عزت۔ توراۃ کی سچائی خدا کی خدائی۔ ان سب میں کوئی چیز بھی الزام سے بری نہیں ہوسکتی۔ اس حالت میں دو ہی صورتیں تھیں۔

(الف) توراۃ کو سچ مانتے ہیں تو خدائے بنی اسرائیل کی کبریائی اور ہارونؑ کی عزت میں فرق آتا ہے۔

(ب) خدا کی کبریائی اور ہارون کی عزت پر نظر پڑتی ہے تو توراۃ کا بیان غلط معلوم ہوتا ہے

اسلام کا دعویٰ یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں جو اختلافات پیدا ہوگئے ہیں ان میں اکثر کا فیصلہ قرآن کریم سے ہوجاتا ہے۔ سورۂ نمل میں نہایت بلند آواز سے اس دعویٰ کی منادی کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

| | |
|---|---|
| اِنَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ یَقُصُّ عَلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اَكْثَرَ الَّذِیْ ھُمْ فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ۔ وَاِنَّهٗ لَھُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۔ اِنَّ رَبَّكَ یَقْضِیْ بَیْنَھُمْ بِحُكْمِهٖ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْعَلِیْمُ | بیشک یہ قرآن بنی اسرائیل کی اکثر باتوں (کی حقیقت واقعی) کو جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔ ان پر ظاہر کرتا ہے اور بے شک یہ قرآن (ایمان والوں کے حق میں (ازسرتاپا) ہدایت و رحمت ہے۔ (اے پیغمبر) کچھ شک نہیں کہ تمہارا پروردگار (قرآن کو نازل کرکے) اپنے حکم سے ان |
| (جزو ۲۔ سورہ ۲۷۔ آیت ۷) | |

کے آپس کے اختلافات) کا فیصلہ فرماتا ہے۔ اور وہ زبردست (اور سب کچھ) جانتا ہے۔

یہ دعویٰ تھا اور اس کی دلیل یہی گوسالہ سامری کا واقعہ ہے، قرآن کریم نے صاف بتادیا کہ موجودہ تورات میں یہودیوں نے اس واقعہ کو غلط پیرایہ میں درج کردیا ہے ہارونؑ جیسے عظمت و شان کے بزرگ کا یہ شیوہ نہ تھا کہ وہ گوسالہ بنا کر پوجتے۔ اور خلق کو گمراہ کرتے۔ یہ تو سامری کا کام تھا۔

———(۷)———

توراۃ کی اصلاح و تصحیح کرنے والوں کو ہارون کے متعلق غلط فہمی پیدا ہونے کے غالباً دو سبب ہوئے ہوں گے ۔ ا۔

(الف) کوہ طور پر جاتے وقت حضرت موسیٰ اپنے بھائی ہارون کو بنی اسرائیل کا محافظ مقرر کر گئے تھے ۔ محافظ کے لئے عبرانی زبان میں سامر یا شامر کا لفظ استعمال ہوا کرتا ہے مصلحین و مترجمین توراۃ نے جب "سامری" کا قصہ پڑھا ہوگا تو وہ سمجھے ہوں گے کہ یہ کسی شخص کا نام نہیں ہے ۔ بلکہ اس سے وہ شخص مراد ہے جو بنی اسرائیل کا محافظ تھا ۔ اور ظاہر ہے کہ محافظت کی خدمت ہارونؑ ہی کو تفویض ہوئی تھی ۔

(ب) حضرت موسیٰؑ جب کوہ طور سے واپس آئے تو انہوں نے ہارونؑ کو بڑی سختی سے ملامت کی کہ تم نے اپنے فرض میں کس لئے کوتاہی جائز رکھی اور لوگوں کو گمراہ ہونے دیا ظاہر ہے کہ یہ ملامت صرف ان کے فرائض محافظت پر مبنی تھی اسی طرح جیسے کہ سرکار عالی کی جانب سے عوام کی بدعنوانیوں کی پرسش قوم کے سرگروہوں سے کی جاتی ہے لیکن یہودی مصححین یہ دیکھ کر کہ توراۃ میں حضرت موسیٰؑ کا لہجہ ہارون کی نسبت نہایت سخت اور ملامت آمیز ہے یہ سمجھے کہ ہارونؑ ہی نے وہ بچھڑا بنایا تھا ۔

یہ روداد ہے ان واقعات کی جن میں کئی ہزار برس سے اختلاف چلا آتا ہے ۔ ناظرین کو اختیار ہے کہ قرآن کریم کے فیصلہ کو سچ مانیں یا توراۃ کی غلطیوں پر جمے رہیں ۔

—— (۸) ——

سامری کو حضرت موسیٰؑ نے جن الفاظ میں بد دعا دی تھی وہ یہ تھے ۔

فَاذهب فَاِنَّ لَكَ فى الحياةِ ان تقول لا مساس ۔ چل دور ہو ۔ اس زندگی میں تیری یہ سزا ہے کہ (زندگی بھر) کہتا پھر کہ (دیکھو مجھے کوئی) چھو نہ جانا (ورنہ ہم دونوں کو تپ آ جائے گی) ۔

یہ ترجمہ مفسرین کی عام روایت کے مطابق ہے اور لامساس کے لفظ نے اس کی بنیاد ڈالی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ لامساس کے معنی ملنے جلنے سے ممانعت کے ہیں۔ سامری کی ضلالت دیکھ کر حضرت موسیٰ نے اس کو منع کر دیا تھا کہ خبردار! اب زندگی بھر کسی سے نہ ملنا جلنا۔[۱] کیونکہ ظاہر ہے کہ گمراہی کا مرض اسی صورت میں متعدی ہوا کرتا ہے۔ تپ کے آنے نہ آنے سے نہ اس کو کوئی تعلق ہے نہ قرآن کریم اس قصہ کا موید ہے۔ اور نہ صحیح تاریخی روایتیں اس کی حامی ہیں۔ ذالک قولھم بافواھھم۔

---

[۱]۔ تفسیر کبیر۔ جلد ۶ صفحہ ۶۹ (وجہ ثانی)

---

اگر آپ اپنا مقام تبدیل کریں تو اپنے جدید پتہ کی اطلاع دفتر ترجمان القرآن" کو ضرور دے دیا کریں۔ ورنہ پرچہ نہ پہنچنے کی ذمہ داری اس دفتر پر نہ ہوگی

منیجر

# ہمارا قرآن اور ہم

از

مولنا الحاج ابو الخیر محمد خیر اللہ صاحب سنوسی القادری المحمدی (ورنگل)

اصلاح حال امت کے بہت سودے ہیں جو بہی خواہان قوم کے سروں میں سمائے ہوئے ہیں ہبت سی نارسا فکریں ہیں جو بلا انتظار نتائج محو تفاخر بھی ہیں۔ آج بعض شناسان علالت قومی نے اپنی جگہ بہت سے نسخے تجویز کر رکھے ہیں جن کو یورپ کے قرابادین سے تلاش کیا گیا ہے اور وہ اس مریض بے درمان کو بار بار حل کرکے پلائے بھی گئے مگر دا د مسیحائی نہ ملنی تھی نہ ملی کیونکہ وہ موافق مزاج ہونے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے تھے۔ شافی مطلق نے جو نسخہ شفار اس مریض کے لئے ازل سے تجویز فرمایا تھا۔ وہ وہی تھا جس نے اپنا مفید و مجرب ہونا ساری دنیا کو تسلیم کرا دیا تھا۔ وہ سرچشمہ رحمت آلہی کا جرعہ جان بخش تھا جس کو پی کر لاکھوں مردے زندہ ہو چکے تھے۔ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ؕ

ہماری بدحواسی کا کیا ٹھکانا ہے کہ ہم اپنی صحت و عافیت کے لئے اس آزمودہ اور مجرب نسخہ کی جانب بھولے سے بھی توجہ کرنا نہیں چاہتے۔ اگر کبھی کوئی متوجہ کرا دے تو اس کی اس ہمدردی کا مضحکہ اڑایا جاتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ سبب عارض و مرض لاحق سے اس نسخہ شفار کو کوئی تعلق یا نسبت ہی نہیں ہے۔ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۔

یہ داستان غم طویل اور دردناک ہے اور یہ مختصر مضمون اس طول داستان کا تحمل بھی نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اس جگر خراش سلسلہ سے قطع نظر کرکے کچھ عرض کیا جاتا ہے۔

ہماری آیندہ ترقی کے خواب اگر اپنی کوئی صحیح تعبیر ہمکو بتا سکتے ہیں۔ تردد فلاح وفکر اصلاح اگر اپنے صحیح معیار پر قائم ہو سکتے ہیں تو اس کی صرف یہی ایک راہ ہے کہ ہم اپنی نشارۃ اولیٰ پر پورے انہماک کے ساتھ نظر رکھیں اور یہ دیکھیں کہ ہماری ابتدا کس طرح ہوئی تھی ہم اس پر غور کریں کہ ایک بے آب وگیاہ ریگستان، ایک لق و دق دشت وبیابان کے بسنے والے خانہ بدوش۔ اُمّی نا آشنائے تہذیب وتمدن مٹھی بھر عرب آناً فاناً کیسے ساری دنیا پر چھا گئے؟ وہ کیا تھا جس نے قیصر وکسریٰ کے تخت کو تاراج کر دیا، اینٹ سے اینٹ بجا دی؟ سارے عالم پر اپنا سکہ بٹھا یا؟ وہ کس کی ہیبت وصولت تھی جس سے مشرق ومغرب کانپ اٹھے تھے؟ وہ کونسا عمل تسخیر تھا جس کو پڑھکر عرب کے چرواہوں نے دنیا پر حکومت کرنا سیکھا تھا۔ اور دنیا والوں کو جہانداری وجہانگیری کے گر بتائے تھے؟ وہ کونسی تعلیم تھی جس نے دنیا میں ایک حیرت انگیز انقلاب پیدا کر دیا؟ وہ کونسا گھر تھا جس میں طفل تہذیب نے جنم لیا تھا؟ وہ کونسا کالج تھا جس کی تربیت وتعلیم وتمدن آفریں ثابت ہوئی؟ وہ کس کی آغوش ناز تھی جس میں پرورش پاکر ترقی عالم کا یہ موجودہ سلسلہ یوں دم خم دکھا رہا ہے؟ وہ کونسا خاندان ہے جس سے دنیا کی اس تہذیب کا سلسلۂ نسب جا ملتا ہے؟ ذرا غور وفکر سے کام لیا جائے کہ معدودے چند بادیہ نشین جنہوں نے زمین وآسمان کو ہلا دیا تھا وہ کس زمین کے نشو ونما یافتہ تھے کس کی سرکردگی میں اُن سے یہ کارنامے ظاہر ہوئے؟ کس قانون نے ان سے یہ نظام قائم کرایا کس ضابطہ نے ایک صحرائی اور وحشی زندگی کو یوں مہذب بنایا؟ کیا اس کا جواب قرآن! قرآن!! قرآن!!! کے سوا تاریخ عالم کچھ اور دے سکتی ہے۔؟

پھر ہم خود یہ کیا کہے جا رہے ہیں کہ اسلام عروج وترقی کا حامی نہیں ہے۔ اس کے قوانین کی حکم برداری مانع ترقی وتمدن ہے۔ ہم جب تک احکام اسلام کے جوئے کو اپنی گردن سے نہ اتار پھینکیں اس وقت تک یہ دنیا ہماری نہیں ہو سکتی۔ جو کچھ جا چکا ہے وہ اسی مجبوری سے کھویا گیا اور جو باقی ہے وہ بھی اسی نقص کی بدولت حوالہ دستبرد زمانہ ہونے کو ہے وغیرہ۔

اگر یہ صحیح ہے تو اسلامیت نے دنیا پر اس قدر مدت مدید تک اسی قانون الہٰی کے تحت کیسی پرشوکت وعظمت حکومت کی تھی؟ کس طرح سارے عالم میں اپنا اجالا پھیلایا تھا؟ کس طرح تقویم پارینۂ عالم کو مٹا کر زندگی کا ایک نیا پروگرام دنیا کے سامنے پیش کیا تھا؟ اور کس قوت پر یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ تا قیام دنیا اس کے اصول وضوابط مسلمانوں کی قومی دینی اور دنیوی کے کفیل رہیں گے؟

کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے کہ اسی قرآن حکیم کے ایک شاگرد رشید فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اسی قانون وضابطۂ الہٰی کے سامنے زانوے ادب تہہ کر کے اس کے تیس پاروں کی روشنی میں سیاست دانی کا وہ عملی ثبوت دیا تھا جس کی نظیر آج تاریخ میں ڈھونڈھنے سے بھی نہیں ملتی؟ صرف دس بیس سال کے اندر تعلیم قرآنی کے تحت تاریخ عالم کا الٹ دینا ساری دنیا کو تو انگشت بدندان کر سکتا ہے۔ مگر کیا یہ اندھیر نہیں ہے کہ مسلمانوں کی آنکھیں آج اُسے دیکھ بھی نہیں سکتیں؟

دورِ حاضر کے تمدن اور عہد رواں کی تہذیب نے ایسے کتنے سررشتے اور صیغے حکمرانی کے بنائے ہیں جن کی داغ بیل حضور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانۂ خلافت میں نہیں ڈالی تھی۔ سیاست مدن، نظم ونسق مملکت، قواعد وضوابط سلطنت غرض وہ دستور فاروقی جو آج آپ کی سوانح طیبہ میں بہ تفصیل موجود ہے کس تعلیم کا نتیجہ تھا؟ کیا وہ اس قرآنی یونیورسٹی کے سوا کسی اور تعلیم گاہ کا رہین منت ہے؟ کیا حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا وہ کسی اور تربیت کا شرمندۂ احسان ہے؟

کیا عزم وثبات، جرأت واستقلال فاروقی کے سبق کسی اور معلم سے ملے تھے؟ بصائر وعبر قومی تعمیر کے درس کیا قرآن کے سوا کسی اور کتاب نے دنیا کو سکھائے تھے؟

ہاں رونا ہے تو اس کا کہ آپ نے قرآن میں ان خزاین السمٰوٰت والارض کو دیکھا ہی نہیں آپ کا معاملہ تو اس خصوص میں یہ ہے: لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا واقع ہوا ہے یعنی دل ودماغ ضرور ہیں مگر غور وفکر کا مادہ سلب ہو چکا

ہے۔ کان بھی ہیں آنکھیں بھی ہیں، مگر دیکھے اور سنے کون؟

حیرت ہے کہ ہم اپنے دنیا کے کاروبار کے ذرا ذرا سے معاملہ میں اسی دل و دماغ اسی آنکھ کان اور اسی فہم و فراست سے وہ وہ کام لیتے ہیں کہ دیکھنے والوں کو ہماری عقل و دانش پر رشک ہونے لگتا ہے۔ مگر ان سے کام نہیں لیتے تو اپنے دین و آخرت کے معاملہ میں خاموش ہیں تو تعلیم قرآن کے بارے میں۔

افسوس صد افسوس! آج ہم اس نعمت قرآنی، دولت ایمانی ثروت دو جہانی کے ساتھ جس بے اعتنائی کو برت رہے ہیں جس غفلت میں مبتلا ہوگئے ہیں وہ عالم اسلام کا ایک حادثہ عظیم ہے۔ ان آنکھوں کو کہاں تلاش کیجئے جو اس رنج و غم میں اشک ریز ہوں؟ وہ ہاتھ کہاں ملیں گے جو اس ماتم میں سینہ کوبی کے نظارے دکھا سکیں؟ وہ مجلسیں کہاں ہیں جو ضیاع ملت میں صف آرائے عزا ہو سکیں؟ پھر آہ وہ دست تدبیر کہاں ہے جو ہماری آنکھوں سے اس پردۂ غفلت کو الٹ دے؟ اس طبیب مہربان کا کیا پتہ ہو جو مرہم نہ جراحات جگر ہو سکے؟ وہ کونسا دماغ ہے جس میں اس مرہم سامانی کے لئے کوئی فکر و تردد کار فرما ہو وہ ناخن تدبیر کہاں جو گرہ کشائے کار ثابت ہو جائے؟

ہمارے فساد کار کا یہی ایک موجب اور زوال قومی کا یہی واحد باعث ہے کہ ہم نے خدا کی دی ہوئی قرآنی تعلیم کو چھوڑ دیا۔ آج اس سے کوئی کیونکر انکار کر سکتا ہے کہ جب سے ہم نے اسے چھوڑا ہے زمانہ نے بھی ہمارا ساتھ چھوڑ دیا جب سے ہم نے اس مولی کے کام کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ اس نے بھی ہم کو بھلا دیا۔

حدیث میں ارشاد ہے کہ ساری عبادتوں سے بہتر عبادت تلاوت قرآن ہے جب کہ وہ نماز میں کھڑے ہو کر کی جائے۔ جناب علی مرتضیٰ فرماتے ہیں۔ جو شخص کھڑا ہو کر نماز میں قرآن پڑھے اس کو ہر حرف کے بدلے سو سو ثواب ملیں گے۔ اور بیٹھ کر پڑھنے والے کے لئے ۵۰۔۵۰ اور نماز کے سوا ر با وضو

قرآن پڑھنے والے کو ۲۵ - بے وضو (قرآن کو بلا چھوئے) پڑھنے والے کو دس نیکیوں کا ثواب ملے گا۔ پھر فرماتے ہیں کہ جب سوداگری کرتا ہی ہے تو زیادہ نفع کا کیوں نہ کیا جائے۔ حضور والا نے ارشاد فرمایا کوئی فرشتہ یا پیغمبر قیامت کے دن خدا کے ہاں قرآن سے زیادہ شفیع نہیں ہوگا۔ ایک دفعہ ارشاد ہوا دلوں میں لوہے کی طرح زنگ لگ جاتا ہے۔ صحابہ کرام نے بادب عرض کیا یا رسول اللہ ؐ پھر وہ چھوٹتا کس طرح ہے جواب عطا ہوا قرآن پڑھنے اور موت کو یاد کرنے سے۔

فرمایا جو بندہ تلاوت قرآن میں مصروف ہو کر دعا نہ مانگ سکے خداوند تعالیٰ شانہ ارشاد فرماتا ہے کہ میں اس کو (اس مصروفیت کے طفیل میں) بے مانگے اتنا دوں گا جتنا مانگنے والوں کو نہیں ملتا (کیسا)

جب وہ ہادی کونین (صلعم) دنیا سے پردہ فرمانے لگا تو ہمیں یوں وصیت فرمائی تھی۔

ترکت فیکم الواعظین صامتًا وناطقًا الصامت الموت والناطق القرآن (الحدیث)

یعنے میں اپنے پیچھے تم لوگوں میں دو واعظوں کو چھوڑے جا رہا ہوں جن میں ایک خاموش واعظ "موت" اور دوسرا گویا واعظ "قرآن" ہے۔

واعظ خاموش موت کی تو ہم ایک نہیں سنتے حالانکہ اس کے وقت کا کچھ ٹھیک نہیں ہے وہ کہکر نہیں آتی۔ وہ دھوکے سے شکار کھیلتی ہے خلاف توقع (جس کو لوگ غلطی سے "بے وقت" کہتے ہیں) آ دبوچتی ہے ممکن ہے کہ ابھی آ جائے یا شام تک۔ وہ ہم سے بہت قریب بلکہ سر پر سوار ہے مگر ہم اس سے بہت بے خبر اور تغافل شعار ہیں۔ جب تک ہم کسی عزیز قریب کا جنازہ نکلتے نہ دیکھ لیں اس کا کوئی کھٹکا ہی نہیں ہوتا اور جو ہوتا بھی ہے تو چند لمحوں سے زیادہ کا نہیں۔

رہا وہ دوسرا بولتا چالتا واعظ "قرآن" افسوس صد افسوس کہ اس سے ہمارا کوئی علاقہ ہی نہ رہا ہمنے تو اس کو طاق نسیان کا گلدستہ بنا رکھا ہے وہ تو اس وقت تک مخمل و کمخواب کے غلافوں سے باہر نہیں نکلتا جب تک گھر کے کسی مرنے والے کے سرہانے یاسین خوانی کی ضرورت داعی نہ ہو۔ یا اس کے

سوم وچہلم میں ایصال ثواب کی نہ ٹھیرے۔ یا نور نظر و لخت جگر کی بیماری میں اس کو ہوا دینے اور دم کرنے کی حاجت درپیش نہ ہو جائے یا قرۃ البصر کے دفع آسیب کے لئے کسی آیت کو تعویذ بنانے کی یا کٓھیٰعٓصٓ کا فتیلہ جلانے کی ضرورت نہ پڑ جائے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

غرض کسی وجہ سے کبھی کچھ پڑھ بھی لیا تو معنی و مطلب سے کوئی واسطہ ہوتا ہے نہ غور و تدبر سے کوئی سروکار۔ حالانکہ اس فرمان واجب الاذعان کا نازل فرمانے والا بار بار پکارے جا رہا ہے کہ تم اسے سمجھو اور غور کرو کہ اس کے نزول کی غرض محض تمہارا استفادہ اور اصلاح حال ہے۔ اور اسی لیے ہم نے اس کو آسان کر دیا ہے۔ پھر کوئی ہے جو اس کو سمجھے اور فائدہ اٹھائے؟ وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ فَھَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ اس ارشاد باری کی ہماری نظروں میں کوئی وقعت ہی نہ رہی سارے فساد کی یہی جڑ اور ساری خرابیوں کا یہی ایک سرچشمہ ہے نہ ہم اس سے بے اعتنائی کرتے نہ یہ روز بد دیکھتے۔ آج ترجموں اور تفسیروں کی کمی نہیں ہے۔ کمی ہے تو ہماری توجہ کی۔ کمی ہے خانہ برانداز غفلت سے ہمارے بیدار ہونے کی۔ قرآن نے حین نزول کفّار کی شان میں فرمایا تھا:

"اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُھَا" کیا یہ لوگ قرآن کے مطالب پر غور نہیں کرتے یا اُن کے دلوں پر قفل لگے ہیں۔

مگر وائے بدقسمتی کہ یہ سوال آج خود ہم مسلمانوں کے مقابلہ میں ہونے لگا ہے۔ نیرنگی دوران نے کیا سے کیا کر دیا۔ بگڑنے کی یہ بھی کوئی حد ہے کہ قلب ماہیت ہی ہو کر رہے (اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْن

—(٭٭)—

# قرآن کے اسماء

از جناب ابو المعالی لئیق احمد صاحب فائق نعمانی ۔ نظام آباد

---

قرآن مجید کی امتیازی خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس کتاب کے جتنے نام وحی الٰہی نے رکھے ہیں وہ سب ایک خاص معنوی شان رکھتے ہیں۔ اور اس کے مقصدِ تنزیل اور اس کی تعلیم کی نوعیت پر پوری روشنی ڈالتے ہیں۔ نیز ان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس مقدس کلام کے اندر اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی ضروریات دینی و دنیوی کی تکمیل فرمائی ہے۔ اس جگہ میں قرآن مجید و فرقان حمید کے انہی اسماء کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں جو خود قرآن میں وارد ہوئے ہیں۔ اور جن میں سے ہر ایک اسم میں اس کتاب کے کسی نہ کسی خاص کمال کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

۱۔ سب سے پہلا نام قرآن ہے جس سے یہ پاک کتاب ساری دنیا میں عام طور پر مشہور ہے یہ نام وحی الٰہی کے اندر متعدد مرتبہ آیا ہے:۔ ... شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ

تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ وَقُرْآنٍ مُّبِينٍ ۔

قُرْآنًا فَرَقْنَاهُ لِتَقْرَأَهُ عَلَى النَّاسِ عَلَىٰ مُكْثٍ ۔

وَلَوْ أَنَّ قُرْآنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ أَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْأَرْضُ أَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتَىٰ ۔

لَوْ أَنْزَلْنَا هَٰذَا الْقُرْآنَ عَلَىٰ جَبَلٍ لَرَأَيْتَهُ خَاشِعًا مُتَصَدِّعًا مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ

إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ

اِنَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ یَھْدِیْ لِلَّتِیْ ھِیَ اَقْوَمُ۔

نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا ھُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَۃٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ۔

لفظ قرآن قرآ سے مشتق ہے جس کے معنی جمع کے ہیں یعنی اکٹھا کرنا یا ایک چیز کو دوسری کے ساتھ ملانا اور چونکہ پڑھنے میں حروف کو ایک دوسرے کے ساتھ ملایا جاتا ہے اس لئے قرء کے معنی پڑھنے کے بھی ہیں اور اس معنی کے لحاظ سے اس کتاب کا نام قرآن فرمایا اور اس پر خود قرآن کریم شاہد ہے کیونکہ سب سے پہلی وحی جس میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب فرمایا ہے۔ اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ یعنی اپنے رب کے نام سے پڑھ جس نے پیدا کیا۔ پس سب سے پہلا لفظ وحی نبوت کا اِقْرَأْ ہے اور اسی کے مطابق اس پاک وحی کا نام قرآن فرمایا یعنی جو چیز پڑھی جاتی چاہیے۔

مگر قرآن کے معنی اسی حد تک محدود نہیں ہیں۔ لفظ قرآن کے اندر اس کتاب کے ہمیشہ پڑھے جانے کی پیش گوئی بھی ہے کون کہہ سکتا تھا کہ یہ کلام جو آنحضرت محمد مصطفٰے صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل ہو رہا ہے دنیا میں ایسی قوت حاصل کریگا کہ ساری دنیا اس کو پڑھے گی اور اسی صورت میں پڑھے گی جس صورت میں وہ نازل ہوا پھر کیسی صفائی سے پیش گوئی آج پوری ہو رہی ہے۔ قرآن کو پڑھے جانے کے لحاظ سے ایک ایسا امتیاز دیا گیا ہے جو کسی اور کتاب کو حاصل نہیں۔ اگر دوسری کتابیں بھی قرآن کی طرح پڑھی جاتیں یا اسی طرح پڑھے جانے کے قابل سمجھی جاتیں تو وہ بھی اسم قرآن کی مستحق ہو جاتیں لیکن خدائے بزرگ و برتر نے اس لفظ کو صرف ایک ہی کتاب کے لئے مخصوص فرمایا ہے اور اسی کو یہ فخر حاصل ہے کہ ساری دنیا میں کوئی کتاب نہیں جو قرآن کے برابر پڑھی جاتی ہو کوئی آبادی ایسی نہیں جو اس کی قرأت سے خالی ہو کوئی ملک کوئی شہر ایسا نہیں جو اس کے پڑھنے والوں سے خالی ہو۔ جب سے قرآن پاک کا نزول ہوا ہے اسی وقت سے اس کو یہ عزت حاصل ہو گئی کہ پڑھے جانے میں اس کی برابری کوئی دوسری کتاب نہ کر سکی پس یہ کیسا پر معنی کیسا پر حکمت لفظ ہے جو اس کتاب کے نام کے لئے مخصوص ہوا۔ ایسی عزت تو عالم

کون وفساد میں کسی کتاب کو بھی میسر نہ ہوئی۔

(۲) دوسرا عظیم الشان نام قرآن حکیم کا الکتاب ہے چنانچہ قرآن حکیم کی ابتدا ہی ان الفاظ سے ہوتی ہے۔ الٓمٓ۔ ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ۔ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ" یہ نام بھی قرآن حکیم کے اندر بار بار آیا ہے اور کتب سے مشتق ہے جس کے معنی لکھنے کے ہیں گویا اس میں اس کے لکھے جانے کی طرف اشارہ تھا چنانچہ جب سے حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر وحی کا نزول شروع ہوا اسی وقت سے آپ نے اس کے لکھنے کا بھی اہتمام فرمایا بلکہ اس کے لکھنے والوں کے متعلق بھی ایک پیش گوئی ہے۔ بِاَيْدِي سَفَرَةٍ كِرَامٍ بَرَرَةٍ۔ یعنی اس کے لکھنے والے بڑے بڑے مرتبوں پر پہنچیں گے چنانچہ اس کے اول کاتب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسے انسان تھے جن کو صدیق کا خطاب عطا کیا گیا تھا۔ اور جن کو مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت افضل البشر بعد النبی کہتی ہے۔ ان کے علاوہ جس قدر بڑے آدمیوں نے قرآن کریم کی کتابت کی ہے ایسے معزز آدمیوں نے دنیا میں کسی کتاب کی کتابت نہیں کی بڑے بڑے عظیم الشان بادشاہ بھی قرآن حکیم کی کتابت کرتے رہے جیسے عمر بن عبد العزیز۔ نصیر الدین محمود غازی محی الدین اورنگ زیب۔

۳۔ ایک نام قرآن کریم کا الذکر ہے اور بعض جگہ دوسری صورت میں ذکریٰ اور تذکرہ بھی آیا ہے جیسے فرمایا "اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ۔ ذکر کے معنی عربی زبان میں یاد دلانے اور ناموری اور شرف کے ہیں اول معنی کے لحاظ سے اس نام کے رکھنے میں یہ بتانا مقصود ہے کہ اس کی تعلیم ان باتوں کو یاد دلاتی ہے جو انسان کی فطرت کے اندر مستور ہیں گویا اس نام میں اسلام کے فطری مذہب ہونے کی طرف اشارہ ہے اور دوسرے معنی کے لحاظ سے الذکر میں اس کتاب کے شرف وعزت حاصل کرنے اور تمام کتابوں میں سربرآوردہ اور نامور ہونے کی طرف اشارہ ہے اور یہ اشارہ بھی ہے کہ اس کو قبول کرنے والے اور اس کی نصائح پر عمل کرنے والے دنیا میں شرف حاصل کریں گے جیسا کہ ایک جگہ

فرمایا وَاِنَّہٗ لَذِکْرٌ لَّکَ وَلِقَوْمِکَ اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا فِیْہِ ذِکْرُکُمْ۔

۴۔ ایک نام الفرقان ہے۔ تَبَارَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ لِیَکُوْنَ لِلْعَالَمِیْنَ نَذِیْرًا۔ فرقان کے معنی فرق کردینے والے کے ہیں اور مراد اس سے یہ ہے کہ یہ کتاب حق و باطل میں فرق کردینے والی ہے۔ اس کی تعلیم ایسی کھلی کھلی ہے کہ حق و باطل میں کھلا کھلا فرق کردیتی ہے اسی لئے یوں بھی فرمایا لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ دین اسلام میں کوئی جبر و زبردستی نہیں کیونکہ رشد و گمراہی یعنی حق و باطل کھلے کھلے الگ ہوگئے ہیں۔

۵۔ ایک نام الھدیٰ ہے یہ بھی کثرت کے ساتھ قرآن میں آیا ہے چنانچہ۔ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ۔ اور قُلْ اِنَّ ھُدَی اللّٰہِ ھُوَ الْھُدٰی۔ یعنی اے پیغمبر ان سے کہدو کہ یقیناً اللہ کی ہدایت ہی الھدیٰ ہے۔ یعنی انسان کے لئے حقیقی اور سچی ہدایت قرآن پاک ہے۔ ہدایت سے مراد یہ ہے کہ انسان کو راہ دکھا کر اس کے کمال تک پہونچاتا ہے۔

۶۔ ایک نام التنزیل ہے وَاِنَّہٗ لَتَنْزِیْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ گویا یہ انسان کا کلام نہیں بلکہ منجانب اللہ وحی ہے۔

۷۔ ایک نام حکم ہے اور حکیم محکم اور حکمۃ بھی فرمایا۔ کَذٰلِکَ اَنْزَلْنٰہُ حُکْمًا عَرَبِیًّا الخ اسماء میں یہ اشارہ ہے کہ قرآن کریم مضبوط فیصلے کرتا ہے اور اس کے اندر دانائی اور حکمت کی باتیں ہیں

۸۔ ایک نام الموعظہ ہے مَوْعِظَۃٌ لِّلْمُتَّقِیْنَ اس میں لوگوں کے لئے وعظ اور نصیحت کی باتیں ہیں۔

۹۔ ایک نام الشفاء ہے ھُدًی وَّ شِفَآءٌ سارے اخلاقی اور روحانی امراض کا علاج ہے بلکہ ہر ایک بیماری کا علاج ہے جو انسانوں اور قوموں کو تباہ کردیتی ہے۔

۱۰۔ ایک نام الرحمۃ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک رحمت ہے۔

(۱۱) ایک نام الخیر ہے یعنی انسان کی کل بھلائی کی باتیں اس کے اندر جمع کر دی ہیں یا یہ کہ سراسر بھلائی ہی بھلائی اس میں ہے اور کوئی نقصان پہونچانے والی اور تکلیف پہونچانے والی بات نہیں ہے۔

۱۲۔ ایک نام الروح ہے کَذٰلِكَ اَنزَلنَا اِلَیكَ رُوحًا مِّن اَمرِنَا ۔ اس میں یہ بتانا مقصود ہے کہ انسان کو حقیقی زندگی اسی کلام سے ملتی ہے۔

(۱۳) ایک البیان ہے اور مبین بھی فرمایا یعنی اس کے اندر ہر ایک ضروری بات کھول کر بیان کر دی گئی ہے اور اچھی طرح واضح کر دی گئی ہے۔ کوئی الجھاؤ نہیں ہے۔ کوئی بات تشنہ نہیں ہے۔ حق پر جتنے پردے تھے سب ہٹا دیے گئے ہیں۔

۱۴۔ ایک نام البرہان ہے قَد جَآءَكُم بُرهَانٌ مِّن رَّبِّكُم اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اس کے اندر نرے دعوے ہی دعوے نہیں بلکہ دلائل بھی ہیں گویا جس امر کا دعویٰ کیا ہے اس کی دلیل بھی ساتھ ہی دی ہے۔

۱۵۔ ایک نام الحق ہے یعنی سچائی۔ گویا سب سچائیاں اس کے اندر ہیں اور جو کچھ اس کے اندر ہے سب حق ہے الحق نام میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ دنیا میں مضبوط پاؤں جمائے گی اور کوئی چیز اسے اکھیڑ نہیں سکتی

۱۶۔ ایک نام القیم ہے یعنی قائم رکھنے والی۔ درحقیقت اسی کے ذریعہ سے دنیا کا قیام ہے کیونکہ اگر اس کے ذریعہ سے دنیا میں روشنی نہ پھیلتی تو دنیا تباہ ہو جاتی پھر یہ صداقت کو بھی قائم رکھتی ہے اور ہر ایک انسان کو بھی سیدھی راہ پر قائم رکھتی ہے اس کے اندر کوئی ٹیڑھا پن نہیں ہے۔

۱۷۔ ایک نام المہیمن ہے یعنی حفاظت کرنے والی وَاَنزَلنَا اِلَیكَ الكِتٰبَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَینَ یَدَیهِ مِنَ الكِتٰبِ وَمُهَیمِنًا عَلَیهِ یعنی کل سابقہ کتابوں کی جو اس سے پہلے آچکیں حفاظت کرنے والی ہے ہر ایک صداقت جو ان کتابوں میں اس قابل تھی کہ اسے باقی رکھا جائے اس کی حفاظت قرآن حکیم نے کر دی۔

۱۸۔ ایک نام المبارک ہے جس کے معنے ہیں کثیر خیرہ دائم برکتہ یعنی وہ برکت جو کبھی منقطع نہیں ہوتی جہاں توریت اور انجیل کے ذکر کے ساتھ قرآن کریم کا ذکر کیا ہے وہاں کوئی ایسا لفظ بھی بڑھا دیا ہے یہ بتانے کے لئے کہ اس کتاب کی خیر و برکت ہمیشہ تک ہے پہلی کتابوں کی طرح منقطع نہ ہو جائیگی۔

۱۹۔ ایک نام حبل اللہ ہے وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا یعنی یہ اللہ تک پہنچانیکا ذریعہ ہے کیونکہ حبل کے معنی ذریعہ کے ہیں۔

۲۰۔ ایک نام اس کا مصدّق بھی ہے کیونکہ دنیا میں یہی ایک کتاب ہے جس نے دنیا کے سارے نبیوں کی تصدیق کی اور ان پر ایمان لانا ضروری قرار دیا۔

۲۱۔ ایک نام اس کا النور بھی ہے وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا نور وہ چیز ہے جس سے امتیاز پیدا ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے بھی جو روشنی ڈالی اس نے سب چیزوں میں امتیاز کر دیا۔ کھرا کھوٹا۔ کامل ناقص۔ بھلا برا۔ نیک و بد۔ ضلالت و ہدایت۔ نور ظلمت سب الگ الگ نظر آگئے اور یہ وہ نور ہے جس نے دنیا کی ساری تاریکیوں کو دور کیا۔

شرک کی ظلمت۔ توہمات کی ظلمت۔ بت پرستی کی ظلمت۔ انسان پرستی کی ظلمت۔ حرص وہوا کی ظلمت رسم و رواج کی ظلمت۔ غرض سب ظلمتوں کے پردے چاک کر دیے۔

ان کے علاوہ اور بھی کئی اسمار قرآن کریم کے آئے ہیں۔ سر دست اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے ان اسمار سے بھی ظاہر ہے کہ کس طرح خدائے بزرگ و برتر نے اس کتاب پاک کے مختلف نام رکھکر یہ بتا دیا ہے کہ ہر ایک قسم کی ضرورت اس کے اندر پوری کر دی گئی۔

اگر ایک طرف اَكْمَلْتُ کا دعوی ہے کہ اس کتاب کے ذریعہ سے دین کو ہم نے کامل کر دیا تو دوسری طرف اس کے کمال کے مختلف پہلوؤں کو بھی مختلف اسمار میں ظاہر کر دیا ہے۔

# حقیقت شرک

(از)

ازجناب چودہری غلام احمد صاحب پرویز (ہوم ڈیپارٹمنٹ نئی دہلی)

کرسمس کی تعطیلات میں میں دہلی سے پنجاب کیطرف جارہا تھا۔ جاڑے کی شدت۔ رات کا سفر۔ منہ سر لپیٹے اوپر کے تختے پر لیٹا ہوا تھا۔ کچھ تو غنودگی اور کچھ برق رفتار فرنٹیر میل کا شور۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد کوئی اسٹیشن قریب آیا۔ گاڑی کی رفتار کم ہونے سے شور میں قدرے تخفیف ہوئی تو یہ آواز میرے کان میں آئی۔

"تو حضرت! اس سے تو یہ معلوم ہوا کہ اللہ میاں بھی یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ ان کا نام لیوا کسی اور کا نام بھی لے"۔

"بیشک۔ میاں! کیا تم نے دنیا کے بادشاہوں کو نہیں دیکھا۔ ایک کی رعایا کسی اور کا خیال دل میں لائے۔ گردن اڑادی جاتی ہے یا نہیں!"

"قبلہ معاف رکھئے۔ یہ تو انسانی جذبات ہیں جنہیں اللہ میاں سے منسوب کرنا کچھ بھلا معلوم نہیں ہوتا"

"لاحول ولا قوۃ ......

گاڑی رکنے کے جھٹکے سے یہ آخری جملہ پورا نہ ہوسکا۔ میں نے اَٹھا کر لحاف سے منہ باہر نکالا۔ دیکھتا ہوں تو معترض صاحب ایک نوجوان انگریزی لباس پہنے ہوئے ہیں۔ اور مجیب صاحب ایک پرانی وضع کے متشرع بزرگ۔ ہر دو حضرات اسی اسٹیشن پر اتر گئے۔

وہ تو اس بحث کو یوں ادہورا چھوڑ کر چل دیے اور میرے لئے۔ بقول علامہ اقبال۔

دکھلا کے اک جھلک وہ تو پردے میں چھپ گئے
اور کہہ گئے نگاہ سے ڈھونڈا کرے کوئی

باقی ماندہ سفر کے زادراہ کا سامان فراہم کر گئے۔

میں نے گرد و پیش نظر دوڑائی تو دیکھا کہ اجتناب شرک کے لئے عام طور پر وہی توجیہ پیش کی جاتی ہے جو ان بزرگ صاحب نے اپنے جواب میں پیش کی تھی اور حقیقت یہ ہے کہ ایک شرک پر ہی کیا موقوف ہے۔ ذہن انسانی کی افتاد ہی کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ وہ ماورائے سرحد ادراک کو بھی کھینچ تان کر محسوسات کے دائرہ میں لانے کی کوشش کرتا ہے، اور اس کی چشم نظارہ جو حقیقت مستور کو لباس مجاز میں دیکھنے کی اس قدر متمنی ہے کہ وہ اس تصور کے بغیر جبین نیاز کے سجدہ ہائے بیتاب کو اذن نقوش آرائی ہی نہیں دیتی۔ اللہ تعالیٰ نے ان انسانوں کو جو اپنی صفات لم یزلی سے متعارف کیا تو لامحالہ زبان بھی انسانوں کی ہی استعمال میں آئی اس لئے کہ خدا اور عام انسانوں کے درمیان اور کوئی ذریعہ فہم و تفہیم نہیں ہو سکتا تھا نتیجہ یہ کہ محسوسات کا خوگر ذہن انسانی فوراً انسانوں کی طرف منتقل ہو گیا۔ اور اس غلو و شدت سے کہ تنزیہ و تجسیم کی لامتناہی بحثیں معرض وجود میں آ گئیں اور لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ۔ اور سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ کی لِم نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کو مالک الملک قرار دیکر زمینوں اور آسمانوں کی بادشاہت کو جو اپنے اور صرف اپنے لئے مخصوص فرمایا تو انسانی ذہن نے اللہ میاں کا تصور ایک مطلق العنان، خود مختار بادشاہ کا سامنے لا کھڑا کیا۔ اور اس کی سطوت و جبروت اور شوکت و عظمت کو بھی کچھ ایسا ہی رنگ دیا گیا۔ اور اسی لئے یہ بھی قرار پا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے جو من دون اللہ کی غلامی سے منع فرمایا ہے، اور اس شد و مد سے اس کے لئے وعید فرمائی ہے۔ اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ دنیاوی بادشاہوں کی طرح وہ ذات ایزد متعال بھی یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ اس کا نام لینے والا کسی اور کا خیال بھی دل میں لائے” حالانکہ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ دنیا کے بادشاہوں کی قوت و استیلاء کا راز اس جماعت کی قوت بازو میں مضمر ہوتا ہے جو اس بادشاہ کو اپنا بادشاہ

سمجھتی ہے۔ اور اس کی سلطنت کی فنا و بقا منحصر ہوتی ہے اس جماعت کی قلت و کثرت پر۔ اس لئے اس بادشاہ کو ہر وقت یہ خیال دامن گیر رہتا ہے کہ اس کی رعایا میں سے کسی کے دماغ میں کسی اور بادشاہ کا خیال نہ آجائے لیکن اس کے برخلاف اس مالک حقیقی اس احکم الحاکمین کی حکومت و سطوت انسانی دست و بازو کی رہین منت نہیں۔ اگر تمام دنیا کے انسان اس کی درگاہ صمدیت میں انقیاد و اطاعت گذاری کے طوق گردنوں میں ڈالکر سر نیاز کو خم کر دیں تو اس کی ازلی و ابدی سلطنت میں ایک ذرہ کا اضافہ نہیں ہو سکتا اور اگر تمام دنیا کے انسان اپنی اوندھی کھوپری کے تتبع کی بدولت اس بارگاہ بے نیاز سے سرکشی و تمرد اختیار کر کے راندۂ درگاہ ہو جائیں۔ تو اس کی حکومت میں ایک ذرہ بھر کی کمی نہیں آسکتی۔ اس کے ایوان سلطنت کی تحسین و تزئین میں کسی کے قشقۂ جبین کی سرخی سے کچھ رنگینی نہیں بڑھ سکتی اور سجود نیاز کی قلت سے اس کے سنگ آستان کی درخشندگی میں کچھ کمی نہیں واقع ہو سکتی۔ اس لئے کہ وہ اس وقت بھی باایں ہمہ جبروت و سطوت مالک الملک تھا۔ جبکہ کوئی اس کا نام لینے والا مخلوق نہ ہوا تھا۔ اور اس کی سلطنت اس وقت بھی اسی شان و شوکت سے باقی رہے گی۔ جبکہ اسے پوچھنے والا کوئی انسان باقی نہ رہے گا۔

وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ۔

اس نے انسانوں کو اگر اپنی غلامی (عبودیت) کا حکم دیا ہے تو اس لئے نہیں کہ اس سے اس کی قوت و استیلاء میں اضافہ ہوتا ہے۔ بلکہ محض اس لئے کہ اس میں خود انسانوں کی بھلائی کا راز مضمر ہے۔ اسلام نے تمام عبادات کی لم اسے قرار دیا ہے کہ۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا (جاثیہ ۱۵) جس نے نیک عمل کیا تو اپنے لئے کیا۔ اور اگر برا کام کیا تو اس کا وبال بھی اسی پر ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَمَنْ يَشْكُرْ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ ۔ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ (لقمان ۱۲)

جس نے شکر کیا اس کا فائدہ اس کی اپنی ذات کے لئے ہے اور جس نے (اس کے آگے سر نیاز خم کرنے سے) انکار کیا (تو اس سے اللہ کا کچھ نہیں بگڑ سکتا) وہ تو بے نیاز اور بلند و بالا تر ذات ہے۔

گویا افعال جوارح یا اعمال قلوب سے اللہ تعالیٰ کا کوئی نفع یا نقصان مقصود نہیں وہ ذات انسانی اعمال کے نتائج سے بے نیاز ہے۔ ان کے نتائج تو خود انسان کی ذات کے لئے ہیں۔ دنیاوی بادشاہوں کی طرح وہ انسانی عبادت گذاریوں کا محتاج۔ اور اس کے لئے ممنون احسان نہیں اس نے تو بنی کریم سے فرما دیا کہ:۔

يَمُنُّونَ عَلَيْكَ أَنْ أَسْلَمُوا ۔ قُلْ لَا تَمُنُّوا عَلَيَّ إِسْلَامَكُمْ بَلِ اللهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ أَنْ هَدَاكُمْ لِلْإِيمَانِ ۔ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۔ (حجرات ۱۷)

یہ لوگ احسان دھرتے ہیں کہ اسلام قبول کر لیا؟ حالانکہ دراصل اللہ تم پر احسان کرتا ہے کہ اس نے تم کو ایمان کی طرف رہنمائی کی (اس کا تم اقرار کرو گے) اگر تم سچے ہو۔

جب اسلام کے نزدیک تمام عبادات کی یہی لم ہے۔ تو عقیدہ توحید (جو فی الحقیقت قلب کی ایک اساسی عبادت ہے) بھی اسی اصول پر مبنی ہوگا۔ اس کا راز ہمیں انسانی خلقت کے اندر ملے گا۔

---

قرآن کریم نے تخلیق آدم کا مقصد ہی تفویض خلافت و نیابت الٰہی قرار دیا ہے۔ یعنی انسان پیدا ہی اس غرض سے کیا گیا ہے کہ وہ تمام مخلوقات ارضی و سماوی سے خدمت لے اور اس کائنات پر اپنے آقا کے مقرر کردہ قوانین کے ماتحت حکومت کرے۔ اس کی شہادت میں قرآن کریم بھرا پڑا ہے۔ کہیں لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ سے اس کی عزت و تکریم کی طرف اشارہ ہے اور کہیں وَفَضَّلْنَاهُمْ تَفْضِيلًا سے اس کی فضیلت و بزرگی کا اظہار مقصود ہے۔ کسی جگہ جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ کہا جا کر اس کی حکومت کی شہادت دی گئی ہے اور کہیں اس اجمال کی تفصیل ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَمِيْعًا آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے۔ اس کو تمہارے تابع فرمان کر دیا ہے۔ (۴۵: ۲)

اب ظاہر ہے کہ انسان اگر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے سامنے سر نیاز جھکا کر اپنے تذلل و تعبد کا ثبوت دیگا تو وہ یا تو کوئی دوسرا انسان ہو گا یا ماورا الانسان کوئی اور مخلوق جملہ مخلوقات کے متعلق تو خالق حقیقی کا یہ ارشاد ہمارے سامنے موجود ہے کہ وہ پیدا ہی اس لئے کی گئی ہیں کہ انسان ان سے خدمت لے۔ تو جو چیزیں کسی کی خادم پیدا کیگئی ہوں انہیں مخدوم بنا لینا کہاں کی عقلمندی ہے۔ اب رہے دوسرے انسان، تو پیدائش کے لحاظ سے تمام انسان ایک دوسرے کے برابر ہیں۔ سو اپنے برابر کے سامنے جھکنا یہ انسانی خودداری کے منافی ہے۔ لہذا ظاہر ہے کہ انسانی عبودیت کے اظہار کے لئے اگر کوئی ہستی ہو سکتی ہے تو وہ تمام مخلوقات سے بلند و بالا حتیٰ کہ انسانوں سے بھی اعلیٰ و ارفع ہستی ہونی چاہیے۔ اور یہی وہ ہستی ہو سکتی ہے جس کی غلامی کا طوق انسانوں کے لئے موجب ذلت و رسوائی نہیں بلکہ باعث ہزار شرف و افتخار ہے۔ وہ ہستی جس کے ایک ارادہ سے تمام مخلوقات عدم سے وجود میں آ جائے اور جس کی مشیت کے ماتحت تمام موجودات عدم میں تبدیل ہو جائے جو نیست سے ہست اور ہست سے نیست کرنے پر قادر ہو نہ کہ جو خود اپنی فنا و بقا میں کسی دوسرے کے دستِ قدرت کی محتاج ہو۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ۚ قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ۔ (یونس ۳۴) پوچھئے ان سے کہ جن کو تم اللہ کا شریک بناتے ہو ان میں سے کوئی ہے جو خلقت کو عدم سے وجود میں لائے اور مارنے کے بعد پھر زندہ کر سکے؟ خلقت کے مبدا و معاد کا اگر اختیار ہے تو صرف اللہ کو ہے

انسان فطرۃً خوددار پیدا کیا گیا ہے لیکن اگر دنیا میں یہ اپنی خودداری کو بیچتا ہے تو صرف دو چیزوں کے لئے ایک جلب منفعت اور دوسرے دفع مضرت اسباب و واقعات کا تجزیہ کرتے چلے جاؤ لیکن انسانی

خود داریوں کی شکست کے لیے یہی دو خوفناک چٹانیں نظر آئیں گی۔ خوف یا امید تاریخ کے صفحات کو الٹتے جاؤ
جہاں کہیں انسان نے۔ انسان کے سامنے۔ یا دیگر مخلوقات کے حضور اپنا سر جھکایا ہے انہی دو مقناطیسی کششوں
کی بدولت۔ اپنے اپنے دل کی انتہائی گہرائیوں تک نگاہ کو لے جاؤ (کہ فی انفسکم افلا تبصرون)۔
جس جگہ یہ شیر نیستاں روباہ مزاج ہوتا ہے وہیں یہ دونوں مہیب و خوفناک غار نظر آئیں گے۔

لیکن اگر لغزش کے یہی دونوں مقام تمام سطح ارض و سما سے کہیں اوپرے جاکر رکھ دیے جائیں
تو پھر انسانی سرفرازیوں کی وسعت کا کون اندازہ کرسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَیَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَا لَا یَضُرُّھُمْ وَلَا یَنْفَعُھُمْ (یونس ۱۸) — وہ اللہ کو چھوڑ کر ان کی پوجا کرتے ہیں جو ان کو نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ نفع۔

لیجئے — بھے یہ ہی دو حساب سویوں پاک ہو گئے۔

مخلوقات محکوم۔ اور انسان برابر کا۔ ضرر رسانی و منفعت بخشی کی کس میں طاقت ہے۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ لَا یَمْلِکُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ ۔ (سبا ۲۲) — کہیے ان لوگوں سے کہ خدا کے سوا جن کو تم معبود سمجھ رہے ہو ان کو پکار دیکھو۔ وہ نہ آسمانوں میں کسی ذرہ بھر چیز کے مالک ہیں اور نہ زمین میں۔

یہی وہ چیز تھی کہ توحید کے واعظ اول حضرت خلیل اکبر علیہ السلام کو جب ان کی قوم نے کہا تم
ان بتوں کی اس طرح تکذیب کرتے ہو۔ ان کے جلال سے ڈرو تو اس شناسائے اسرار حقیقت نے بے خوف و
خطر کہدیا کہ

کَیْفَ اَخَافُ مَا اَشْرَکْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّکُمْ اَشْرَکْتُمْ بِاللّٰہِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِہٖ عَلَیْکُمْ سُلْطٰنًا ؕ فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ — جن چیزوں کو تم خدا کا شریک بناتے ہو ان سے میں کیسے ڈروں؟ حالانکہ تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ تم نے اللہ کے ساتھ ان چیزوں کو شریک کیا ہے جن کی شرکت کے

بِالْاَمْنِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (انعام ۔۸۲) اس نے کوئی دلیل نہیں اتاری ڈرنا تو تم کو چاہئے جو خدا کے ساتھ اوروں کو شریک بناکر ایک ایک چیز سے خوف کھاتے ہو اگر تم کچھ عقل و شعور رکھتے ہو تو خود ہی سوچو کہ ہم دونوں میں سے کون بے خوف ہونے کا زیادہ حقدار ہے۔

یعنی وہ جو ان تمام چیزوں سے ڈرتا پھرے جو کچھ نفع و نقصان نہیں پہونچا سکتیں۔ یا وہ جو صرف ایک ذاتِ مطلق کا خوف دل میں رکھکر تمام دنیا کے خوف و خطر سے بے نیاز ہو جائے۔

اقوام گذشتہ و ملل سابقہ کے احوال سامنے لانے سے فوراً معلوم ہو جائیگا کہ جن قوموں نے عناصر طبعی کو اپنا خدا بنائے رکھا۔ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکیں۔

اندر۔ اگنی۔ وایو کے پجاریوں کو دیکھئے مادی ترقیوں میں کہیں پیش پیش نظر نہیں آئیں گے۔ اور مخلوقات سے آگے بڑھکر جنھوں نے انسانوں کو اپنا معبود بنا لیا ان کی روحیں کبھی آزادی کی اس فضائے بسیط میں نہیں اڑ سکیں جو ان کا حقیقی نشیمن و مسکن تھا۔ اس لئے کہ افراد کے اعمال کی طرح اقوام کے اعمال بھی ویسے ہی نتائج پیدا کیا کرتے ہیں۔ اور ان کا جائزہ بھی اس طرح ہی لیا جایا کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن کا ارشاد ہے

لِيَجْزِيَ قَوْمًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۔ اور ہر قوم کو اس کے اعمال کے مطابق بدلہ ملے گا اور ہر ملت كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰى اِلٰى كِتٰبِهَا ۔ (جاثیہ ۱۴) اپنے نامۂ اعمال کی طرف بلائی جائے گی۔

اس لئے ایک توحید پرست کے لئے اس قدر شاندار الفاظ میں پیش گوئی کر دی گئی کہ

اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ ان مذاق اڑانے والوں یعنے ان لوگوں پر جنھوں نے مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۔ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۔ (حجر ۹۵۔۹۶) خدا کے ساتھ اوروں کو بھی معبود بنا رکھا ہے ہم آپکو یقیناً غلبہ دیں گے۔ اور یہ عنقریب خود دیکھ لیں گے۔

قرآنی عقاید کا مفہوم ہی یہی ہے کہ قلب مومن سے خوف و ہراس۔ امید و بیم کے تمام مزعومہ خطرات دور ہو جائیں۔ وہ دنیا میں کسی گوشہ کو اپنی آرزوؤں کا کعبۂ مقصود اور کسی جائے پناہ کو اپنا مامن

لمجا نہ بنلائے۔ وہ ایک کا ہو کر (جو فی الحقیقت اس کا سزاوار ہے) نہ کہ خوف و امید کے حالتوں میں انسانی قلوب کا مرجع و ماویٰ بن سکے) تمام دنیا سے بے نیاز ہو جائے۔ اس نے خوف و حزن دور کرنے کے لئے افواج قاہرہ کے اجتماع اور بروج مشیدہ کی تعمیر کو ہی کافی نہیں سمجھا کیونکہ یہ تمام مادی جسم انسانی کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ بلکہ ان اسباب کو ثانوی چیز قرار دیا۔ اور اولین ضرورت اس قلب کی حفاظت کی سمجھی کہ جس کے بدل جانے سے ہر ایک چیز کا رنگ بدل جاتا ہے۔ اس نے فرمادیا کہ

لَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ (۳ : ۱۳۲)

ہمت نہ ہارو اور رنج نہ کرو تمہیں دنیا میں سب سے بلند تر ہو بشرطیکہ (اپنے دل کو خوف من دون اللہ سے پاک کر کے) صاحب ایمان ہو جاؤ۔

اسلام نے دنیا سے جسمانی غلامی کی زنجیروں کو ہی نیست و نابود نہیں کیا بلکہ ذہنی غلامی کے ادق و سلاسل کو بھی کاٹ کر دور پھینک دیا کہ جس میں نسل انسانی مختلف انواع طریقوں سے گرفتار ہو کر اس فضیلت ازلی کو کھو بیٹھی تھی جو ان کے لئے مایہ امتیاز قرار دی گئی تھی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لئے جس کی رگ و پے میں غلامی سرایت کر چکی تھی۔ دین و دنیا کی صلاح و سرفرازی کی دعا مانگی تو اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ فلاح کا وعدہ تو تمہیں ہے بشرطیکہ یہ اس نبی امی صلعم کی پیروی کریں جس کی بعثت مبارک کا مقصد منجملہ دیگر مقاصد عالیہ یہ ہے کہ :۔۔۔

يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔ (اعراف ۱۵۷)

وہ پاکیزہ چیزیں ان کے لئے حلال کرے گا اور ناپاک خبائث سے انہیں منع کرے گا۔ اور وہ بوجھ اور زنجیریں جن میں یہ جکڑے ہوئے ہوں گے ان سے انہیں نجات دلائے گا۔

چنانچہ بعثت نبوی صلعم کے وقت یہود و نصاریٰ کی یہ حالت تھی کہ ان کے احبار و رہبان ان کے دل و دماغ پر اس طرح چھا رہے تھے کہ ان کی اپنی ذہنیتیں بالکل مفلوج ہو کے رہ گئی تھیں۔ قرآن کریم نے صاف

صاف بیان فرمادیا کہ ان مذہبی رہنماؤں کو تم نے اس طرح سے خدا بنا رکھا ہے۔ یہ صریحاً شرک ہے۔ انھوں نے تمہارے دماغوں پر جو بیجا تسلط جما رکھا ہے یہ محض ان کے ذاتی مفاد کے لئے حیل و مکائد ہیں ان کو الگ کرکے پھینک دو تاکہ تمہاری روحیں نشوونما پاسکیں۔ اور آزادی کی فضا میں سانس لے کر اپنے اندر قوت تمیز پیدا کرسکیں۔

اسلام اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھا اور اس نے خالص توحید الٰہی کا ایک ایسا بلند مطمح نگاہ سامنے رکھا کہ اس سے قبل دنیا کے کسی گوشہ میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی اس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے۔ یا دیگر مخلوقات کی عبودیت سے ہی نجات دلائی ہو۔ بلکہ اس نے تو انسان کو خود اپنی خواہشات کا تابع بھی نہیں ہونے دیا۔ فرمایا۔

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ (جاثیہ) کیا تم نے اس (راہ گم کردہ) کو بھی دیکھا کہ جس نے خود اپنی خواہشات کو ہی اپنا خدا بنا رکھا ہے۔ اللہ اکبر اسلام نے کس قدر بلند مقصد پیش نظر رکھا ہے اور غلامی و تعبد کی کس قدر باریک سے باریک اور غیر مرئی و غیر محسوس زنجیروں کو کاٹ کے پھینک دیا ہے گویا دوسروں کی ہوائے نفس کا اتباع تو ایک طرف خود اپنے نفس کی خواہشات کا غلام بننا بھی شرک قرار دیدیا۔ اور اپنے تمام ارادوں اور خواہشوں کو اس بزرگ و بالاتر ہستی کی مشیئت و مرضات کے تحت کر دیا کہ جسے "خداوند" ہونے کا بجا حق حاصل ہے۔ گویا عبد مومن کا جو قدم دنیا میں اٹھتا ہے یا اس کے دل میں جو ارادہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ کسی مخلوق کے لئے۔ کسی انسان کے لئے حتیٰ کہ خود اپنے لئے بھی نہیں۔ بلکہ وہ اس خدا کے لئے ہوتا ہے جس کا یہ اپنے آپ کو بندہ کہتا ہے۔

قُلْ اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَ بِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ۔ (۶ : ۱۶۳)

کہدیجئے کہ میری نماز میری قربانی میری زندگی میری موت سب اللہ تبارک و تعالیٰ کے لئے ہے جو تمام عالموں کا پروردگار ہے۔ مجھے اسی بات کا حکم دیا گیا ہے

اور میں سب سے پہلا اطاعت شعار بندہ ہوں۔ اور اگر اس کے ارادے۔ اس کے اعمال اس مطمح نظر کے خلاف ہیں تو وہ شرک ہے۔ توحید نہیں۔

رہ مدہ اقبال را در کعبہ اے شیخ حرم   ہر زمان در آستیں دارد خداوند دگر

آج وہ قومیں جو مادی ترقی میں اپنی نظیر نہیں رکھتیں اسی خوفناک غلطی کی وجہ سے کہ انہوں نے اپنی خواہشات نفسانی کو اپنا خدا بنا رکھا ہے۔ ایسے دردناک عذاب میں مبتلا ہیں کہ انہیں ایک لمحے کے لئے بھی اطمینان قلب نصیب نہیں یہ عذاب

نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ؕ (۱۰۴)   اللہ کی وہ آگ ہے جس کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیتے ہیں۔

---

یہ ہے وہ شرک کہ جس سے اسلام نے اس شدت سے منع فرمایا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس سے بڑھ کر دنیا میں اور کوئی گناہ ہو بھی نہیں سکتا۔ قرآن حکیم نے اس تمام تفصیل کو ایک لفظ کے اندر بند کر کے رکھ دیا ہے فرمایا کہ

اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ (لقمان ۱۲)   واقعی شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

ظلم کے اصلی معنی ہیں تصرف شئی فی غیر محلہ۔ یعنی کسی چیز کا بے محل و بیجا استعمال۔ شرک کو ظلم عظیم اس لئے کہا کہ انسانی تخلیق کا مقصد تو یہ تھا کہ انسان تمام موجوداتِ عالم پر حکمرانی کرے اور ایک خدا کا نائب اور بندہ ہو کر اس کی مخلوقات سے خدمت لے۔ تو جو سر حکومت و سرفرازی کے لئے بنایا گیا ہو وہ اگر محکوم کے آگے جھکنے لگ جائے تو اس سے بڑھ کر اس سر کا بے جا و بے محل استعمال اور کیا ہو سکتا ہے۔ شرک سے اجتناب کا مقصد یہ نہیں کہ اگر غیر خدا کو خدا کا شریک بنا دیا جائے گا۔ تو اس سے خدا کی خدائی میں ضعف پیدا ہو جانے کا احتمال ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ غیر خدا کے سامنے جھکنا تخلیق انسانی کے مقصد کے خلاف ہے اور اس سے انسانی خودداری کی شکست لازم آتی ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ (۹۵)۔   ہم نے تو انسان کو سب مخلوقات سے بہتر پیدا کیا۔ اور یہ بدبخت اپنے اعمال کی بدولت ذلیل سے ذلیل بننے کی کوشش کرتا رہتا ہے

# مذاکرہ علمیہ

## مسئلہ جبر و قدر

(۳)

نظریہ کی حد تک یہ بات معقول ہے لیکن اصلی دقت یہ ہے کہ ہمارے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں جس سے ہم انسان کے کردار میں فطرت اصلیہ، خارجی احوال اور غیر مقدر اختیار کے حصے الگ الگ متعین کر سکیں، اور اپنے اخلاقی احکام کو صرف تیسرے حصے کی حد تک محدود رکھیں اگر اخلاقی قدر و قیمت کا انحصار صرف اسی عنصر کی مقدار پر ہو تو ہمارے لئے کسی شخص کے متعلق نیک یا بد ہونے کا حکم لگانا قطعاً ناممکن ہے کسی آلہ سے ناپ کر، کسی ترازو سے تول کر، کسی طریق تحلیل سے تجزیہ کر کے ہم یہ معلوم نہیں کر سکتے کہ ایک نیک آدمی کس حد تک پیدائشی نیک ہے کس حد تک احوال کا بنایا ہوا نیک ہے، اور کس حد تک اپنے غیر مقدر اختیار کی بنا پر نیک ہے اور ایک برا آدمی کہاں تک مجبوراً برا ہے، اور کہاں تک بالارادہ و بالاختیار برا۔ پس قدریت کے اس نظریہ کو تسلیم کرنے سے ہمارے تمام اخلاقی احکام معطل ہو جاتے ہیں۔ اور صرف اخلاقی احکام ہی نہیں، بلکہ اس کے بعد تو ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم اپنے تعزیری قوانین منسوخ کر دیں، اپنی عدالتوں کو برخاست کر دیں اور جیل خانوں کو توڑ دیں کیونکہ جن مجرموں کو ہم پکڑتے ہیں، اور جن پر ہمارے جج سزا کے فیصلے صادر کرتے ہیں، اور جن کو ہم جیل خانوں میں ٹھونس دیتے ہیں، ان کے متعلق ہمارے بڑے سے بڑے فاضل جج کو بھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان کے جرم میں ان کے اپنے غیر مقدر اختیار کا کس حد تک دخل ہوتا ہے اور جب یہ بنیادی چیز غیر معلوم ہے تو کسی طرح ممکن نہیں کہ سزا کی مقدار مجرم کے اختیار کی مقدار کے مطابق ہو۔

اس مرحلہ پر قدریت ایک ایسی سرزمین میں پہنچ جاتی ہے جہاں اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ وہ راستہ کو ٹٹول ٹٹول کر چلنے کی خواہ کتنی ہی کوشش کرے، مگر چند قدم بھی ٹھوکروں اور لغزشوں سے بچ کر نہیں چل سکتی۔ آخر وہ پلٹ کر جبریت سے کہتی ہے کہ اگر میرے نظریہ سے اخلاقی احکام معطل ہو جاتے ہیں۔ اور عدالت کا نظام نہیں چل سکتا، تو نہ صرف بلکہ اس سے زیادہ برا نتیجہ تیرے نظریہ سے بھی حاصل ہوتا ہے تیرے نظریہ کی رو سے تو انسان اپنے کسی فعل کا ذمہ دار ہی نہیں ہے، پھر حسن و قبح کے احکام کس بنا پر؟ مدح و ذم کس چیز کی؟ سزا و تعزیر کے فیصلے کس وجہ سے؟ ایک غیر ذمہ دار آدمی کا نیک یا بد ہونا تو ایسا ہی ہے جیسے کسی شخص کا مریض یا تندرست ہونا۔ پھر جب ایک شخص کو اس بنا پر سزا نہیں دی جاتی کہ اسے بخار کیوں ہے، تو ایک دوسرے شخص کو اس بنا پر کیوں سزا دی جائے کہ اس نے چوری کیوں کی؟

اس سوال کا جبریت کے پاس بھی کوئی معقول جواب نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ جو بات وہ کہہ سکتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ دنیا میں ہر عمل اپنے کچھ قدرتی نتائج رکھتا ہے جس طرح بیماری کا طبیعی نتیجہ تکلیف ہے اور تندرستی کا طبیعی نتیجہ لذت و راحت اسی طرح نیک چلنی کا طبیعی نتیجہ مدح اور انعام ہے۔ اور بد چلنی کا طبیعی نتیجہ ذم اور سزا۔ آگ میں ہاتھ ڈالنے سے ہاتھ کا جل جانا ضروری ہے۔ اسی طرح جرم کرنے سے کسی نہ کسی طرح کی سزا پانا بھی ضروری ہے خواہ آدمی پر اس فعل کی کچھ ذمہ داری نہ ہو لیکن یہ جواب صرف اس صورت میں صحیح ہو سکتا ہے کہ ہم انسان کو ایک عقلی و نفسی وجود کے بجائے محض ایک مادی وجود تسلیم کر لیں، اور یہ مان لیں کہ انسان میں عقل، نفس، روح کوئی چیز نہیں ہے صرف طبیعت ہے جو ایک لگے بندھے قانون کے مطابق کام کئے جا رہی ہے اور انسان اسی طرح اس کے زیر اثر ہے جس طرح درخت، دریا، پہاڑ، اور دوسری موجودات ہیں۔ مگر انسانی زندگی کے مظاہر کی یہ میکانکی تعلیل کسی طرح قابل قبول نہیں ہے۔ اس کے براہین (جن پر بحث کرنے کا یہ موقع نہیں ہے) نہایت کمزور ہیں، اور اس کے تسلیم کر لینے کا پہلا نتیجہ یہ ہے کہ قانون اخلاق مذہب سب بے قدر و قیمت ہو جائیں اور خود انسان بحیثیت انسان ہونے کے دوسری موجودات کے مقابلہ میں کسی شرف عقلی و نفسی کا حامل نہ رہے۔

**اخلاقیات کی ناکامی** اس تمام بحث کا حاصل یہ ہے کہ علم الاخلاق، جبریت اور قدریت کے درمیان فیصلہ کرنے میں ناکام رہا ہے، اور خالص اخلاقی دلائل و شواہد سے ہم کو قطعی طور پر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ انسانی سیرت و کردار کے متعلق جبری نظریہ درست ہے یا قدری نظریہ؟ جتنے قوی دلائل انسان کو ذمہ دار اور فاعل مختار قرار دینے کے حق میں ہیں۔ قریب قریب اتنے ہی زبردست دلائل اس کو غیر ذمہ دار اور قطعاً بے اختیار قرار دینے کے حق میں بھی ہیں۔

اب اس مسئلہ کا آخری پہلو باقی رہ گیا ہے، اور وہ دینی پہلو ہے۔

**دینی نقطہ نظر** دینیات میں یہ مسئلہ قریب قریب اسی حیثیت سے آتا ہے جس حیثیت سے فلسفہ میں اس پر بحث کی گئی ہے، مگر یہاں مشکلات اس سے بہت زیادہ ہیں فلسفہ کی نظر تو صرف امور ماورائے طبیعت پر ہے، اور انسان کی عملی زندگی سے اس کو وہ تعلق نہیں ہے جو حکمت عملی یا اخلاقیات کو ہے مگر دینیات نے کسی نہ کسی طرح سے حکمت عملی اور امور ماورائے طبیعت دونوں پر نظر کی ہے، اور اپنی تعلیمات میں دونوں کو جمع کیا ہے۔ ایک طرف تو ادیان نے انسان کو اوامر و نواہی کا مخاطب ٹھیرایا ہے، اور طاعت پر جزا اور عصیان پر سزا کے مترتب ہونے کا قانون پیش کیا ہے جس کے لئے انسان کا اپنے اعمال میں ذمہ دار اور کسی نہ کسی حد تک مختار ہونا ضروری ہے۔ اور دوسری طرف وہ ایک ایسی بالاتر ہستی یا ایک ایسے بالاتر قانون کا تصور بھی پیش کرتے ہیں۔ جو انسان سمیت تمام کائنات کو محیط ہے، اور جس کی گرفت میں سارا عالم کون و فساد جکڑا ہوا ہے پس دینیات میں یہ مسئلہ فلسفہ طبیعیات، اور اخلاقیات، تینوں سے زیادہ مشکل ہے کیونکہ یہ تینوں تو معاملہ کے محض کسی ایک پہلو کا اثبات کرتے ہیں۔ اور دوسرے پہلو کو اس کے موافق کرنے کی خاطر توڑنے مروڑنے کے لئے آزاد ہیں لیکن مذہب بیک وقت دونوں کا اثبات کرتا ہے اور وہ اپنے اس طریقہ کو عقل کے مطابق ثابت کرنے کے لئے مجبور ہے کہ ان دونوں متعارض باتوں میں موافقت کی کوئی متوسط صورت نکالے۔

یہاں اس بحث کا موقع نہیں ہے کہ دنیا کے دوسرے مذاہب نے اس مشکل کو حل کرنے کی کیا صورت

اختیار کی ہے کیونکہ مجھ سے سوال صرف اسلام کے متعلق کیا گیا ہے، اور اختصار کی خاطر بھی یہ ضروری ہے کہ میں اپنی بحث کو صرف اسی کی حد تک محدود رکھوں۔

**صحیح اسلامی مسلک** جن مسائل کا تعلق امور ماوراء طبیعت سے ہے۔ ان کے بارے میں اسلام کی صحیح تعلیم یہ ہے کہ جس چیز کا جاننا اور جس حد تک جاننا ضروری تھا وہ اللہ اور اس کے رسول نے بتا دی ہے اس سے زیادہ کا کھوج لگانا، اور ایسی باتوں میں خوض کرنا جن کے متعلق یقینی معلومات حاصل کرنے، یا جن کی کنہ کو سمجھنے کے ذرائع ہمارے پاس نہیں ہیں، اور جن کے جاننے سے ہم کو کسی قسم کا نقصان بھی نہیں ہے، لاحاصل بھی ہے، اور خطرناک بھی۔ اسی لئے قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ (ایسی باتوں کے متعلق سوال نہ کرو جن کو اگر تم پر ظاہر کیا جائے تو تم کو برا معلوم ہو۔ ۵: ۱۴) اور اسی لئے فرمایا گیا ہے کہ مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا (جو کچھ رسول نے تم کو دے دیا ہے وہ لے لو اور جس سے منع کیا ہے اس سے باز آجاؤ ۵۹: ۱) اور اسی لئے احادیث نبوی میں کثرت سوال اور فضول باتوں میں تکلف کرنے کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اِنَّ مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكَهُ مَا لَا يَعْنِيهِ[۱] (آدمی کے اسلام کی بہتری اس میں ہے کہ وہ بے فائدہ باتوں کو چھوڑ دے)۔

یہ تقدیر کا مسئلہ بھی من جملہ انہی مسائل کے ہے چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار تاکید فرمائی ہے کہ اس مسئلہ میں بحث کرنے سے پرہیز کیا جائے۔ ایک مرتبہ صحابہ آپس میں اس مسئلہ پر بحث کر رہے تھے۔ اتنے میں آنحضرت تشریف لے آئے اور یہ باتیں سن کر آپ کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا۔ آپ نے فرمایا کیا انہی باتوں کا تم کو حکم دیا گیا ہے؟ کیا اسی لئے میں تم میں بھیجا گیا ہوں؟ ایسی ہی باتوں سے پچھلی قومیں ہلاک ہوئی ہیں میرا فیصلہ یہ ہے کہ تم اس بات میں جھگڑا نہ کرو[۲]۔ ایک دوسرے موقع پر آپ نے فرمایا جو شخص

[۱] یہ حدیث امام زہری نے امام زین العابدینؒ کے واسطہ سے روایت کی ہے۔ (ترمذی) [۲] یہ حدیث مختلف طریقوں سے حضرت عمرؓ حضرت عائشہؓ حضرت انسؓ، حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مروی ہے۔ (دیکھو ترمذی وابن ماجہ)

تقدیر کے بارے میں گفتگو کرے گا اس سے تو قیامت کے دن سوال کیا جائے گا۔ مگر جو خاموش رہے گا اس سے کچھ سوال نہ ہوگا۔[1] مطلب یہ کہ یہ مسئلہ ان معاملات میں سے تو ہے نہیں کہ شرعاً تم پر ان کے بارے میں کلام کرنا ضروری ہو۔ لہٰذا اگر تم اس پر کوئی گفتگو نہ کرو تو قیامت میں تم سے کوئی سوال نہ ہوگا۔ لیکن اگر تم نے کلام کیا تو لامحالہ یا وہ غلط ہوگا یا صحیح۔ اور غلط ہونے کی صورت میں تم ایک ایسی بات میں پکڑے جاؤ گے جس سے بحث کرنے کی تم کو کوئی ضرورت نہ تھی پس بولنے میں نقصان کا احتمال ہے۔ اور نہ بولنے میں کوئی نقصان نہیں ایک اور موقع پر نبی صلے اللہ علیہ وسلم رات کے وقت حضرت علی اور حضرت فاطمہ علیہا السلام کے مکان پر تشریف لے گئے اور پوچھا کہ تم لوگ نماز تہجد کیوں نہیں پڑھتے؟ حضرت علی نے جواب دیا کہ "یا رسول اللہ ہمارے نفس اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ چاہے گا کہ ہم اٹھیں تو اٹھ جائیں گے۔ یہ سن کر حضور فوراً واپس ہو گئے۔[2] اور ران پر ہاتھ مار کر فرمایا۔ وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا (انسان سب سے زیادہ جھگڑالو واقع ہوا ہے)

یہی وجہ ہے کہ محدثین اور فقہا کے گروہ نے صرف وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ کے مجمل اعتقاد پر اکتفا کیا ہے۔ اور وہ اس بات میں زیادہ کھوج لگانے والوں اور جبر یا قدر کا قطعی حکم لگانے والوں کی سخت مذمت کرتے رہے ہیں لیکن رسول اکرم اور بزرگان سلف کی ممانعت کے باوجود دوسری قوموں کے مسائل فلسفہ وطبیعیات کا مطالعہ کرنے کی وجہ سے یہ مسئلہ مسلمانوں میں بھی پیدا ہوا اور بہ کثرت اس پر بحث کی گئی کہ آخرکار یہ اسلامی علم کلام کے مہمات مسائل میں داخل ہو گیا۔

**متکلمین اسلام کے مذاہب** متکلمین اسلام کے اس کے بارے میں دو مشہور مذہب ہیں جو قدریہ اور جبریہ کہلاتے ہیں۔ یہاں ان کی تمام بحثوں کو نقل کرنا تو بہت مشکل ہے کہ اس کے لئے ایک مستقل کتاب کی

---

[1] یہ حدیث حضرت عائشہ سے مروی ہے (ابن ماجہ) [2] اس حدیث کو زہری نے امام زین العابدین سے اور انہوں نے امام حسین ابن علی علیہم السلام سے روایت کیا ہے (بخاری، نسائی) محدثین نے آنحضرت کے واپس پلٹ جانے اور یہ آیت پڑھنے کی مختلف توجیہیں کی ہیں مگر میں اس کے صاف معنی یہ سمجھتا ہوں کہ عملی زندگی کے مسائل میں تقدیر کے مسئلہ سے استدلال کرنے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پسند نہیں فرماتے تھے۔

وسعت درکار ہے تاہم میں ان کے مقالات کا ایک واضح خلاصہ یہاں پیش کروں گا

**مذہب قدر**
معتزلہ اور بعض دوسرے فرقوں کا اعتقاد یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو پیدا کیا، اس کو افعال پر قدرت بخشی، اور نیکی و بدی کا اختیار اسی کو تفویض کر دیا۔ اب وہ خود اپنی قدرت کے مطابق اور اپنی مشیت کے موافق، استقلال کے ساتھ اچھے اور برے افعال کرتا ہے۔ اور اپنے اسی اختیار کی بنا پر دنیا میں مدح وذم اور آخرت میں ثواب و عذاب کا مستحق ہوتا ہے اللہ کی طرف سے نہ اس کو کفر ومعصیت پر مجبور کیا گیا ہے، اور نہ ایمان وطاعت پر۔ بلکہ وہ اپنے رسولوں کو بھیجتا ہے۔ کتابیں نازل کرتا ہے نیکی کا حکم اور بدی سے منع فرماتا ہے صحیح اور غلط، حق اور باطل کو واضح طور پر ممیز کرتا ہے۔ اور ان کو خبردار کر دیتا ہے کہ اگر سیدھا راستہ اختیار کروگے تو نجات پاؤگے اور غلط راستہ پر چلوگے تو اس کا برا نتیجہ دیکھوگے۔

اس مذہب کے قواعد سب سے پہلے واصل بن عطاء الغزال نے مقرر کئے تھے جس کا قول تھا کہ باری تعالیٰ حکیم عادل ہے، اس کی طرف شر اور ظلم کی اضافت جائز نہیں ہے، اور نہ یہ جائز ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو جن اوامر ونواہی سے مکلف کیا ہے، ان کے خلاف اعمال کے صدور کا ارادہ کرے، اور نہ یہ جائز ہے کہ وہ بندوں کو کسی ایسے فعل پر سزا دے جس کا ارتکاب انہوں نے خود اس کے حکم سے کیا ہو لہذا بندہ ہی فاعل خیر و شر ہے، وہی ایمان و کفر اور طاعت و معصیت اختیار کرتا ہے۔ اور اللہ نے ان سب کاموں کی قدرت اس کو عطا کر دی ہے۔ ابراہیم بن سیار النظام نے اس پر یہ اضافہ کیا کہ خدا صرف خیر پر قدرت رکھتا ہے۔ شرور و معاصی اس کی قدرت سے خارج ہیں۔ معمر بن عباد السلمی اور ہشام بن عمرو الفوطی نے اس میں اور زیادہ شدت اختیار کی اور القدر خیرہ وشرہ من اللہ کا اعتقاد رکھنے والے کو کافر اور گمراہ ٹھیرایا کیونکہ یہ اعتقاد ان کے نزدیک باری تعالیٰ کی تنزیہ کے خلاف ہے، اور اس کی رو سے حق تعالیٰ ظالم ٹھیرتا ہے۔ ان کے بعد جاحظ، خیاط، کعبی، جبائی، قاضی عبدالجبار وغیرہ جتنے بڑے بڑے معتزلہ گذرے ہیں سب نے پورے زور کے ساتھ یہ حکم لگایا ہے کہ خدا اپنے بندوں کے افعال کا خالق نہیں ہے بلکہ خود بندے

ان کے خالق ہیں، اور یہ کہ خدا کے لئے تکلیف مالایطاق جائز نہیں ہے۔

**قرآن مجید سے قدریہ کا استدلال**

اس مذہب کی تائید میں معتزلہ نے قرآن مجید کی بہت سی آیات سے استدلال کیا ہے۔ مثلاً

وہ آیات جن میں بندوں کے افعال خود بندوں کی طرف منسوب کئے گئے ہیں جیسے كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ (۲: ۳) فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتَابَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (۲: ۹) ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (۸: ۷)، مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ۔ (۴: ۱۸) كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ[1] (۵۲: ۱)

وہ آیات جن میں کہا گیا ہے کہ انسان کے اپنے اعمال پر جزا و سزا مترتب ہوگی۔ جیسے۔ اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ (۴۰: ۲) اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۴۵: ۴). هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۲۷: ۷)۔

وہ آیات جن میں شر اور ظلم اور مذمومات سے باری تعالیٰ کے فعل کو منزہ قرار دیا گیا ہے جیسے۔ اَلَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ (۳۲: ۱) اور ظاہر ہے کہ کفر اچھی چیز نہیں ہے۔ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ (۱۵: ۶) اور مسلم ہے کہ کفر حق نہیں ہے وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (۴۱: ۶) وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ (۳: ۱۱)۔

وہ آیت جن میں کافروں اور گنہگاروں کو ان کے برے افعال پر ملامت کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ ان کو ایمان و طاعت سے روکنے والی کوئی چیز نہیں ہے۔ جیسے وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا

---

[1] اطناب سے بچنے کے لئے آیات کا ترجمہ نہیں دیا گیا ہے۔ تاہم سورۃ اور رکوع کا نمبر دے دیا گیا ہے۔ جو اصحاب چاہیں حوالے کے مطابق آیات نکال کر کسی مترجم قرآن مجید میں ترجمہ ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

اِذْ جَاءَهُمُ الْهُدٰی (۷: ۱۱) مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ (۳۸: ۵) فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ۔ (۸۴: ۱) لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (۳: ۱۰) اگر فی الواقع خدا نے ان لوگوں کو ایمان لانے سے روکا ہوتا اور انہیں کفر و معصیت پر مجبور کیا ہوتا تو ان سے اس قسم کے سوالات کرنے جائز نہ ہوتے۔ اگر کوئی شخص کسی کو حجرے میں بند کر دے اور کہے کہ تو کیوں نہیں نکلتا تو یہ ایک غیر معقول سوال ہوگا۔ پھر خدا کی طرف یہ بات کیسے منسوب کی جا سکتی ہے۔ کہ ایک طرف تو ان کو حق سے پھیر دے اور پھر کہے کہ تم کہاں پھرے چلے جا رہے ہو؟ (اَنّٰی تُصْرَفُوْنَ) خود ان کو بھٹکائے اور پوچھے کہ تم کدھر بھٹکے جا رہے ہو۔؟ (اَنّٰی یُؤْفَکُوْنَ) ان میں کفر خلق کرے اور پھر پوچھے کہ تم کیوں کفر کرتے ہو؟ (لِمَ تَكْفُرُوْنَ) انہیں حق کو باطل سے چھپانے پر مجبور کرے اور پھر کہے کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو؟ (لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ)۔

وہ آیات جن میں ایمان اور کفر کو بندوں کی مشیت سے متعلق کیا گیا ہے جیسے فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ (۱۸: ۴) فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (۲، ۱: ۱) یہی نہیں بلکہ ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو اپنے کفر و معصیت کو مشیت الٰہی کی طرف منسوب کرتے ہیں جیسے سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا اَشْرَكْنَا (۶: ۱۸) وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ۔ (۱۶: ۵)۔

وہ آیات جن میں بندوں کو حسن عمل کی طرف دعوت دی گئی ہے مثلاً وَسَارِعُوْا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ (۳: ۱۴) اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ (۴۶: ۴) وَاَنِيْبُوْا اِلٰى رَبِّكُمْ (۳۹: ۶) ظاہر ہے کہ طاعت کا حکم دینا اور اس کی طرف دوڑنے اور لپکنے کی تاکید کرنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے، جب تک کہ مامور میں اس کی قدرت نہ ہو۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کسی اپاہج سے کہا جائے کہ اٹھ اور دوڑ

وہ آیات جن میں بیان کیا گیا ہے کہ بندے ایسے افعال کرتے ہیں۔ جن کا خدا نے ان کو حکم نہیں دیا ہے جیسے۔ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ

(۹:۴) إِنَّ اللّٰهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ (۷: ۳) ـ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ (۳۹: ۱) ـ
وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ (۹۸)

وہ آیات جن میں کہا گیا ہے کہ لوگ اپنے کیے کی سزا بھگتتے ہیں۔ جیسے ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ (۳۰: ۵) وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ (۴۲: ۴) إِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَلٰكِنَّ النَّاسَ أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ (۱۰: ۵) وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰى إِلَّا وَأَهْلُهَا ظَالِمُونَ (۲۸: ۶) ـ

وہ آیات جن سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا ہدایت اور گمراہی پر مجبور نہیں کرتا بلکہ انسان خود اپنے اختیار سے کوئی ایک راستہ منتخب کرتا ہے مثلاً ـ وَأَمَّا ثَمُودُ فَهَدَيْنَاهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى (۴۱: ۲) فَمَنِ اهْتَدٰى فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ ـ (۱۰: ۱۰) ـ لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى (۲: ۳۴)

وہ آیات جن میں انبیا نے اپنے قصوروں کا اعتراف کیا ہے اور ان کو خود اپنی طرف منسوب کیا ہے، مثلاً حضرت آدم کہتے ہیں۔ رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا (۷: ۲) حضرت یونس کہتے ہیں۔ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ (۲۱: ۶) حضرت موسیٰ کہتے ہیں رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي (۲۸: ۳)

حضرت نوح کہتے ہیں رَبِّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ أَنْ أَسْأَلَكَ مَا لَيْسَ لِي بِهِ عِلْمٌ (۱۱: ۴)

(باقی)

---

# نرخنامہ و قواعد اشتہارات

| مقدار | ایک ماہ | ۳ ماہ | ۶ ماہ | ایک سال |
|---|---|---|---|---|
| یک صفحہ | ۱۰ | ۲۵ | ۴۵ | ۸۰ |
| نصف صفحہ | ۶ | ۱۵ | ۲۵ | ۴۵ |
| ربع صفحہ | ۴ | ۱۰ | ۱۷ | ۲۵ |

۱۔ کوئی خلاف شریعت یا خلاف تہذیب اشتہار شائع نہ کیا جائے گا۔

۲۔ اشتہار کی اشاعت سے پہلے اجرت پیشگی وصول ہونی ضروری ہے۔

۳۔ صرف وہی چربے قبول کئے جائیں گے جو اس رسالہ کی وضع و ہیئت کا لحاظ رکھ کر تیار کئے گئے ہوں۔

۴۔ نرخنامہ میں کسی قسم کی ترمیم نہیں کی جائے گی۔

۵۔ ٹائیٹل کے صفحات کی اجرت عام نرخنامہ کی بہ نسبت ۵۰ فیصدی زیادہ ہوگی۔

Registered No. M 2950 رجسٹر نمبر آصفیہ (۱۲۰)

# قواعد

رسالہ "ترجمان القرآن" بالعموم ہر ہجری مہینہ کی ۵ تاریخ کو شائع ہوا کرے گا مہینہ کی ۲۵ تاریخ تک جن حضرات کے پاس پرچہ نہ پہنچے وہ دوبارہ لکھکر منگوا سکتے ہیں۔ ختم ماہ کے بعد دوسرے مہینے کی ابتدا میں جن خریداروں کی شکایات موصول ہوں گی ان کو پرچہ قیمتاً دیا جائیگا۔

رسالہ کی موجودہ قیمت میں کسی قسم کی رعایت ممکن نہیں ہے لہذا کوئی صاحب رعایت کا مطالبہ نہ کریں۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرنے میں ہمیشہ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیے لیکن یہ لحاظ رہے کہ رجسٹر نمبر اور چیز ہے اور نمبر خریداری اور چیز۔

اشاعت کے لئے مضامین اور حل طلب شکوک تمام ایڈیٹر کے نام سے بھیجے جائیں۔ لیکن ایڈیٹر پر لازم نہیں ہے کہ ہر چیز شایع کرے

منیجر "ترجمان القرآن"

خیریت آباد (حیدرآباد دکن)

باہتمام مولوی ابو محمد مصلح صاحب اعظم اسٹیم پریس چارمینار حیدرآباد دکن میں طبع ہوا